طلوعِ اسلام

فروری
سنہ ۱۹۵۴ء

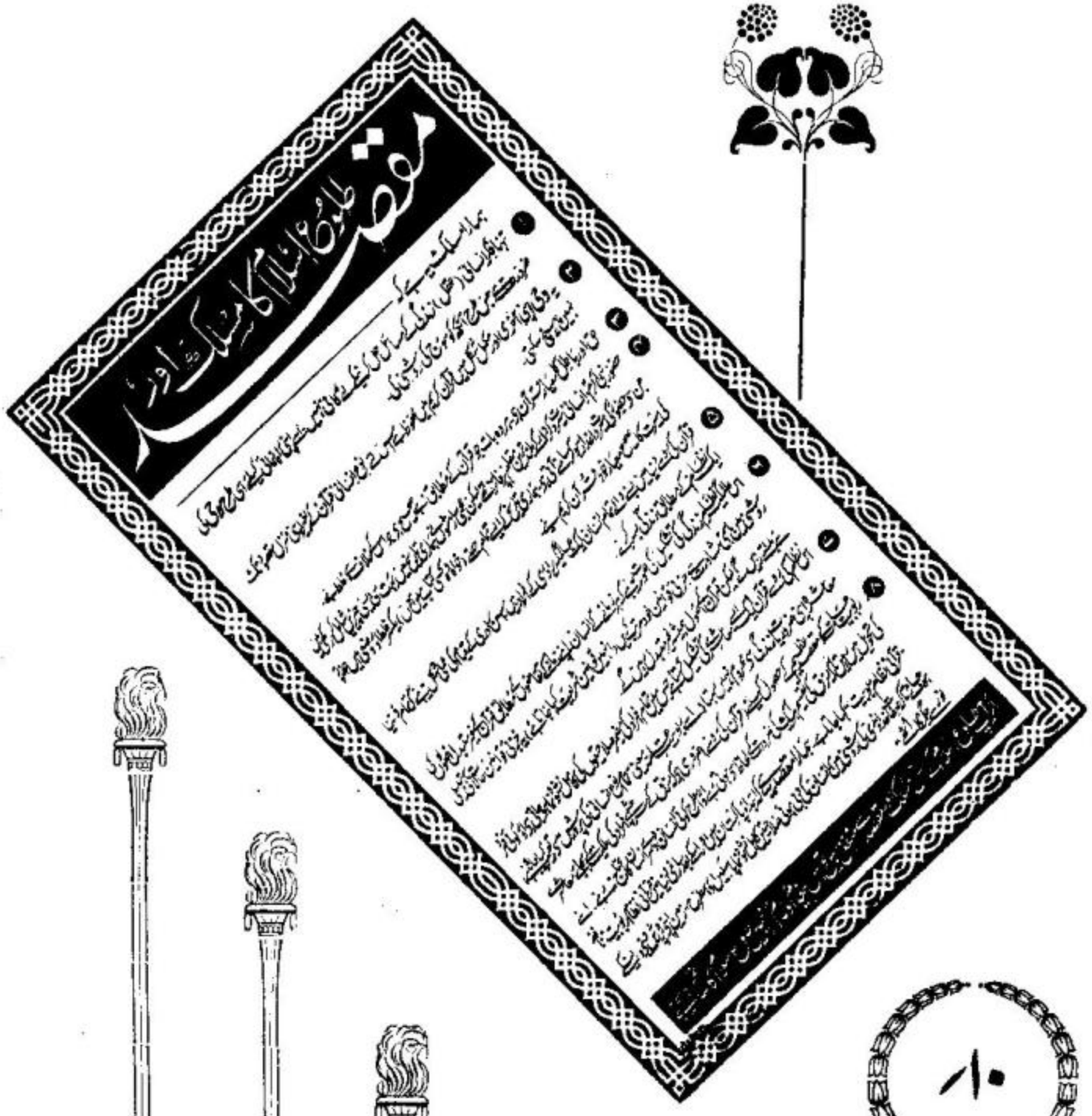

۱۰/

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مرتّب	بدل اشتراک
دس آنے (پاکستانی)	سعید احمد	سالانہ چھ روپے پاکستانی۔ (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

جلد ۷ — فروری ۱۹۵۴ء — نمبر ۲

فہرستِ مضامین

لمعات	—۱۰
تقدیرِ امم کیا ہے؟ (محترم پرویز صاحب)	۱۱ — ۲۰
طاہرہ کے نام (محترم پرویز صاحب)	۲۱ — ۳۰
زمانۂ عدت میں نکاح (محترم پرویز صاحب)	۳۱ — ۳۳
شاید آپ نے غور نہیں کیا؟	۳۴
تنقید مضامین احادیث نزولِ عیسیٰؑ (علامہ تمنا عمادی صاحب)	۳۵ - ۴۹
باب المراسلات	۵۱ - ۵۷
۱۔ پنجاب کی تحقیقاتی کمیٹی	
۲۔ رضاعی بہن بھائی	
۳۔ رہن	
۴۔ مختلف معاشرتی مسائل	
۵۔ ولی اللہ	
حقائق و عبر	۵۸ - ۶۰
۱۔ شرعی سزائیں	
۲۔ کتاب و سنت کی شکل	
نقد و نظر	۶۱ - ۶۳
رفتارِ عالم	۶۴ - ۷۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

انسان دنیا میں آیا تو اللہ کی طرف سے یہ انتظام کر دیا گیا کہ اسے اس کی عقل کی راہنمائی کے لئے ضابطۂ حیات ملتا رہے۔ یہ ضابطہ وحی کے ذریعے سے انبیاءؑ کو ملتا تھا جو اسے انسانوں تک پہنچاتے تھے۔ ان کے اس فریضۂ پیغام رسانی کی وجہ سے انھیں رسول بھی کہا جاتا تھا۔ جب انسانی شعور بلوغت کے دور میں داخل ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اسے ایک ایسا ضابطۂ حیات دیدیا جو اصولی طور پر تمام نوع انسانی کے لئے ہمیشہ کے لئے کافی تھا۔ اس ضابطۂ ہدایت کا نام قرآن ہے۔ چونکہ اب نہ تو کسی نئے ضابطۂ ہدایت کی ضرورت تھی اور نہ ہی اس ضابطہ میں کسی رد و بدل کی گنجائش، اسلئے اس کے بعد نہ نبی کی ضرورت باقی رہی نہ وحی کی۔ لہٰذا، نہ محمدؐ رسول اللہ کے بعد کسی نبی کے آنے کی ضرورت رہی، نہ قرآن کے بعد کسی وحی کی۔ اب انسانی ہدایت کی شکل یہ قرار پا گئی کہ ہر زمانہ کے انسان اپنے زمانہ کے تقاضوں کا حل قرآن کے اصولوں کی روشنی میں اپنی عقل و بصیرت کی رو سے باہمی مشاورت سے دریافت کریں اور انھیں ایک نظام کی شکل میں آگے چلائیں۔ بالفاظ دیگر قرآن نے یہ بتادیا کہ اب انسانوں کو اپنی راہنمائی کیلئے کسی ایسے انسان کی ضرورت نہیں جو یہ کہے کہ مجھے خدا کی طرف سے ایسی چیز ملتی ہے جو تمہارے پاس نہیں، اسلئے تمہیں میری بات کو بطور سند کے تسلیم کرنا ہوگا۔

اگر ہم جذبات پرستی سے ہٹ کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے گا کہ یہ نظام عقل و بصیرت کے عین مطابق اور شرف انسانیت کا حامل تھا۔ اس سے انسان کو وہ بلند مقام مل جاتا تھا جس میں اس کی انسانیت کی تکمیل ہوتی تھی۔ لیکن جیسا کہ خود قرآن نے بتایا ہے یہ نظام ان لوگوں کیلئے سخت ناگواری کا باعث تھا جو اشخاص پرستی کے خوگر تھے یا جن کی مفاد پرستیوں کا تقاضا تھا کہ لوگ خدا کے قانون کی جگہ خود ان کی اطاعت کریں۔ رسول اللہ صلعم کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ان قوتوں نے سر نکالنا شروع کر دیا اور اس کے بعد یہ بڑھتی اور پھیلتی ہی چلی گئیں۔ چنانچہ مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ تاریخ درحقیقت انہی قوتوں کی سرگرمیوں کی تاریخ ہے۔ ان قوتوں نے کیا یہ کہ مسلمانوں میں اس قسم کے عقائد پیدا کر دیئے جن کی رو سے وہ نظام اور قانون کی طرف سے ہٹ کر اشخاص اور افراد کو اپنی اطاعتوں کا مرکز بنالیں۔

جہانتک تاریخ شہادت دیتی ہے، ان عقائد میں سب سے پہلا عقیدہ امام منصوص کا ہے۔ اس عقیدہ کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح خدا کی طرف سے نبی آتا ہے اسی طرح سے خدا ہی کی طرف سے امام بھی آتا ہے۔ امام پر اسی طرح وحی آتی ہے جس طرح نبی پر وحی آتی ہے۔ وہ جس چیز کو چاہے حلال قرار دے اور جسے چاہے حرام قرار دیدے۔ اسلئے کہ (جری لھم مثل ما جری لمحمدؐ)[1] ان ائمہ کو بھی وہی اختیارات حاصل ہیں جو رسول اللہ صلعم کو حاصل تھے۔ یہ عقیدہ چونکہ کچھ تشدد سا تھا کیونکہ اس میں رسول اللہؐ کے بعد وحی کے سلسلہ کو بھی جاری رکھا گیا تھا اسلئے ایک اور عقیدہ وضع کیا گیا جو

---

[1] اصول کافی کے الفاظ یہ ہیں فھم یحلون مایشاؤن ویحرمون مایشاؤن۔

اس سے ذرا زم تھا۔ اس عقیدہ کی رو سے یہ کہا گیا کہ وحی کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک کو وحی کہتے ہیں اور دوسری کو الہام۔ اس کیلئے یہ کہا گیا کہ خود رسول اللہ صلعم کو بھی ان دونوں قسموں کی وحی ملتی تھی ایک وحی قرآن کے اندر ہے۔ اس وحی کا سلسلہ تو قرآن کی تکمیل کے ساتھ ختم ہو گیا۔ دوسری قسم کی وحی (یعنی الہام) قرآن سے باہر ہے۔ اور یہ سلسلہ آگے بھی چلتا ہے۔ اس میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ جہاں تک مستند ہونے کا تعلق ہے الہام بھی اسی طرح سے منجانب اللہ ہوتا ہے، لہٰذا مستند، جس طرح سے وحی، البتہ الہام کا درجہ وحی سے ذرا کم ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس عقیدہ اور پہلے عقیدہ میں محض لفظی فرق ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے دونوں کا مفہوم اور مقصود ایک ہی ہے۔ یعنی ختم نبوت نہ اس سے باقی رہتی ہے نہ اس سے قرآن، دین کی آخری سند نہ اُس میں رہتا ہے نہ اس میں۔ اُس میں بھی قرآن کے قوانین اور نظام ملت کے برعکس اطاعت ان افراد کی کرنی ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے منصوص ہوں اور اس عقیدہ میں بھی یہی افراد مرکز توجہ اور قبلۂ اطاعت بنے رہتے ہیں۔ اسلئے کہ (مثلاً) اگر ایک طرف تمام مسلمان یہ کہیں کہ ہماری سمجھ کے مطابق فلاں معاملہ میں قرآن کا یہ منشاء ہے اور دوسری طرف ایک شخص یہ کہے کہ مجھے خدا کی طرف سے الہام ہوا ہے کہ بات یوں ہے تو مذکورہ بالا عقیدہ کی رو سے اس شخص کے قول کو اس طرح سند ماننا پڑیگا جس طرح رسول کی وحی کو تمام انسانی فیصلوں کے مقابلے میں سند ماننا پڑتا ہے۔ چنانچہ وہ پہلا عقیدہ (یعنی امام منصوص کا عقیدہ) تو ایک خاص فرقہ کے اندر محدود رہا لیکن وہی عقیدہ ایک ذرا سی لفظی تبدیلی کے ساتھ (یعنی وحی کی جگہ الہام کہہ کر) باقی تمام مسلمانوں میں پھیل گیا۔ ظاہر ہے کہ جب آپ انسانی تفقہ اور تدبر کے مقابلہ میں الہام کو اتنا بڑا درجہ دیدیں تو خدا کی طرف سے الہام حاصل کرنے کے طریقے بعید مقبول اور واجب التکریم قرار پا جائیں گے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں جگہ جگہ تصوف کی خانقاہیں کھل گئیں اور ان میں "باطنی تعلیم" کے نصاب مقرر ہوئے۔ اور کشف و الہام کے حصول کی راہیں وضع ہونی شروع ہو گئیں۔ اگر آپ تصوف کے ان مختلف طریقوں کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے بیشتر سلسلے (سوائے ایک آدھ سلسلے کے جو بعد میں جا کر ایجاد ہوا) انہی حضرات کی وساطت سے خدا تک پہنچتا ہے جنہیں اول الذکر عقیدہ کی رو سے ائمہ منصوص مانا جاتا ہے۔ کم از کم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو اس عقیدہ کی رو سے سب سے پہلے امام منصوص مانے جاتے ہیں تصوف کے ان مختلف سلسلوں کے منتہیٰ ہیں۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ یہ کہ جب اس عقیدہ کی رو سے یہ تسلیم کیا گیا کہ بارہویں امام منصوص آخری زمانے میں ظہور فرمائیں گے تو بعینہٖ یہی عقیدہ باقی تمام مسلمانوں میں بھی رائج ہو گیا کہ حضرت امام مہدی آخری زمانے میں تشریف لائیں گے۔ چونکہ اس خانقاہیت کی زندگی میں عیسائیوں کی رہبانیت کو بھی بڑا دخل تھا اسلئے مسلمانوں میں عیسائیوں کا یہ عقیدہ بھی پھیل گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی آسمان سے دوبارہ نزول فرمائیں گے۔

آپ نے غور کیا ہوگا کہ اس ایک عقیدہ سے کہ خدا کی طرف سے الہام بھی ملتا ہے کس طرح ختم نبوت کی مہر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اور "ما سوی من اللہ" کے لئے دروازے ہی نہیں بڑے بڑے پھاٹک کس آسانی سے کھل گئے۔ اس پھاٹک سے جو یورش ہوئی اس سے قرآن مظلوم کی کیا گت بنی۔ اسے تو چھوڑیئے (یہ ایک الگ موضوع ہے، جس کے متعلق کسی دوسری فرصت میں یہ بتایا جائیگا کہ کشف و الہام کی رو سے قرآن کی آیتوں کے کیسے کیسے دلچسپ معانی متعین کئے گئے) اس وقت صرف یہ دیکھئے کہ اس یورش سے ملت کا کیا حشر ہوا۔ اس سے پہلے تو اولیاء اللہ کا ایک تصور پیدا ہوا جنہیں مومنین سے بہت اونچا سمجھا گیا۔ ان اولیاء اللہ میں غوث، قطب، ابدال، حتیٰ کہ مجذوب، تمام

خدائی اختیارات کے حامل سمجھے جانے لگے۔ زندگی ہی میں نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی ان کی قبروں کی پرستش ہونے لگی۔ زمین کے نیچے ایک نئی دنیا بسادی گئی اور زندہ انسانوں کی دنیا کے تمام فیصلے ان مُردوں کے ہاتھوں میں دیدیئے گئے۔ ان کے اقوال، ارشاداتِ خداوندی اور ان کے ملفوظات، دین کی آخری سند قرار پاگئے۔ جب آنیوالے کا عقیدہ عام ہوا تو پھر اس کے بھی دعویدار پیدا ہوگئے کہ ہم ہی وہ آنیوالے ہیں ۔ اس طرح ملت میں امام مہدی آنے شروع ہوگئے۔ اس سے طبیعت سیر نہ ہوئی تو ہر صدی پر ایک مجدد ماموری من اللہ کی حیثیت سے آنے لگ گیا اور پھر بعض لوگوں نے نبوت کا بھی دعویٰ کردیا۔ ہمارے اس دور میں نبوت کے دو دعویدار پیدا ہوئے۔ ایران میں بہاؤ اللہ اور پنجاب میں مرزا غلام احمد۔ ایرانی نبوت نے بات صاف صاف کہدی۔ اسلئے کہ اس کی نمود اس ملک میں ہوئی تھی جہاں یہ عقیدہ موجود تھا کہ رسول اللہ کے بعد وحی کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ حضرات ائمہ منصوص کو وحی ملسکتی ہے اور وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دے سکتے ہیں۔ اس لئے بہاؤ اللہ نے صاف صاف کہدیا کہ میں نبی ہوں۔ مجھ پر وحی آتی ہے۔ میں ایک نیا دین لایا ہوں اور اس کے ماننے والے ایک نئی امت ہیں۔ بات صاف تھی۔ جو اسے سچا سمجھتا ہے وہ اس کا متبع بن کر ایک نیا دین اختیار کرلیتا ہے اور ایک نئی امت کا فرد بن جاتا ہے۔ مسلمانوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔ لیکن مرزا صاحب کیلئے یہ دشواری تھی کہ یہ اس ملک میں پیدا ہوئے جہاں سنیوں کی کثرت تھی۔ اس لئے وہ بھپٹ سے اس قسم کا دعویٰ نہیں کرسکتے تھے کہ ان پر وحی آتی ہے۔ وہ کوئی نیا دین لائے ہیں۔ ان کے متبعین ایک الگ امت بن گئے ہیں۔ انھوں نے یہ سب کچھ تدریجاً کیا۔ چنانچہ جب شروع شروع میں ان پر اعتراض ہوا کہ وہ کہیں بہاؤ اللہ کی طرح نبی بننے کے ارادے تو نہیں کر رہے تو انھوں نے اس سے انکار کیا اور اس انکار کی تائید میں دلیل ہی یہ پیش کی کہ ایک نبی پر وحی آیا کرتی ہے۔ اس کے پاس جبرئیل آتا ہے۔ وہ ایک نیا دین لاتا ہے۔ وہ ایک نئی امت بناتا ہے۔ دیکھئے وہ ان باتوں کا کس طرح سے اقرار کرتے ہیں۔ وہ مکتوباتِ احمدیہ جلد پنجم نمبر چہارم ص ۳۲ پر لکھتے ہیں کہ

> انبیاء اس لئے آتے ہیں کہ تا ایک دین سے دوسرے دین میں داخل کریں اور قبلہ سے دوسرا قبلہ مقرر کرادیں اور بعض احکام کو منسوخ کریں اور بعض نئے احکام لائیں۔

وحی کے متعلق انھوں نے کہا کہ

> ہمارے رسول صلعم کے بعد نبی کیونکر آسکتا ہے درآنحالیکہ آپ کی وفات کے بعد وحی منقطع ہوگئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر نبیوں کا خاتمہ فرمادیا۔ (حمامۃ البشریٰ ص ۳۴)

حضرت جبرئیلؑ کے متعلق فرماتے ہیں کہ

> اب جبرئیل بعد وفات رسول اللہ صلعم ہمیشہ کیلئے وحی نبوت لانے سے منع کیا گیا ہے . . . . قرآن کریم بعد خاتم النبیین کسی رسول کا آنا جائز نہیں رکھتا خواہ وہ نیا ہو یا پرانا کیونکہ رسولؐ کو علم دین بتوسط جبرئیل ملتا ہے اور باب نزول جبرئیل بہ پیرایۂ وحی رسالت مسدود ہے۔ (ازالۂ اوہام ص ۵۳۴ و ص ۷۶۱)

نئی امت کے متعلق

جو شخص نبوت کا دعویٰ کریگا اس دعوے میں ضرور ہے کہ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک امت بنادے جو اس کو نبی سمجھتی ہو اور اس کی کتاب کو کتاب اللہ جانتی ہو۔　　　(آئینہ کمالات اسلام ص۳۳۲)

اس طرح مرزا صاحب نے وحی اور جبرئیل کی آمد سے انکار کرکے اس طریقہ سے تو احتراز برتا جس سے سنیوں کی جماعت بدکتی تھی لیکن اس راستہ کو اختیار کیا جس کی یہ خوگر چلی آرہی تھی۔ یعنی وہی الہام کا راستہ۔ چنانچہ وہ اب اس رنگ سے سامنے آئے کہ

خدا کلام اور خطاب کرتا ہے اس امت کے ولیوں کے ساتھ اور ان کو انبیاء کا رنگ دیا جاتا ہے۔ (مواہب الرحمٰن ص۶۶)

مسلمان اس پر اعتراض ہی نہیں کرسکتے تھے کیونکہ ولیوں پر الہام کا عقیدہ ان کے ہاں موجود تھا۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے فرمایا:

عرصہ بیس سال سے متواتر اس عاجز کو الہام ہوا ہے۔ (خط مندرجہ اخبار الحکم قادیان مورخہ ۱۷ اگست ۱۸۹۹ء)

اس سے بھی کسے انکار ہوسکتا تھا کیونکہ اس کی تردید کون کرسکتا ہے کہ فلاں شخص کو الہام ہوا ہے یا نہیں۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھے اور فرمایا کہ

ہم وحی نبوت کے نہیں بلکہ وحی ولایت کے جو زیر سایہ نبوت محمدیہ اور باتباع آنجناب صلعم اولیاء اللہ کو ملتی ہے اس کے ہم قائل ہیں اور ہمارا دعویٰ صرف ولایت اور مجددیت کا ہے۔　　(اشتہار مرزا صاحب مورخہ ۲ر شعبان ۱۳۱۴ھ)

یعنی اب الہام کی جگہ وحی ولایت کے الفاظ استعمال ہوئے جن میں دونوں سمتوں کی گنجائش موجود تھی۔ اس سے ذرا اور آگے بڑھے تو فرمایا کہ

شریعت میں نبی کے قائم مقام محدث رکھے گئے ہیں۔ (شہادۃ القرآن ص۲۸)

۔ ۔ ۔ میں اللہ کی طرف سے محدث اور اللہ کا کلیم ہوں تاکہ دین مصطفےٰ کی تجدید کروں۔ (آئینہ کمالات اسلام ص۳۸۳)

یعنی وحی ولایت کے بعد یہ فرمایا کہ ولایت نبوت کے قائم مقام ہوتی ہے۔ اس کے بعد وحی ولایت میں سے ولایت کو کاٹ دیا اور فرمایا کہ

ہم پر کئی سالوں سے وحی نازل ہورہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے ہم نبی ہیں۔ امر حق کے پہنچانے میں کسی قسم کا اخفاء نہ رکھنا چاہئے۔

(اخبار بدر قادیان مورخہ ۵ مارچ ۱۹۰۸ء)

وحی بھی بالکل قرآن کی طرح چنانچہ وہ دُرِّ ثمین کے ص۲۸۷ پر زبانِ شعر میں فرماتے ہیں:

آنچہ من بشنوم ز وحی خدا　　بخدا پاک دانمش ز خطا
ہمچو قرآں منزہ اش دانم　　از خطا ہا ہمیں است ایمانم

وہ اپنی وحی پر اسی طرح ایمان رکھتے تھے جیسے کہ تورات و انجیل اور قرآن مقدس پر۔ چنانچہ

مجھے اپنی وحی پر ایسا ہی ایمان ہے جیسا کہ تورات، انجیل اور قرآن کریم پر۔　(اربعین ۴ ص۲۵)

یعنی اب الہام کی جگہ وحی نے لے لی۔ پہلے انھوں نے لکھا تھا کہ جبرئیلؑ انبیاء کرامؑ کی طرف وحی لیکر آتا ہے[1]۔ اب یہ فرمایا کہ وہ جبرئیلؑ

---

[1] مرزا صاحب نے لکھا تھا کہ جبرئیلؑ تمام انبیاء کی طرف آتا تھا لیکن ان کے امتی قاضی محمد یوسف صاحب قادیانی لکھتے ہیں کہ قرآن میں نزول جبرئیل بہ پیرایہ وحی صرف حضرت محمد صلعم کے واسطے ثابت ہے دوسرے انبیاء کے واسطے جبرئیل کا نزول از روئے قرآن ثابت نہیں۔ (النبوۃ فی الالہام ص۲۸)
اور اب مرزا بشیر الدین محمود صاحب فرماتے ہیں کہ جبرئیل غیر انبیاء کی طرف بھی آتا ہے (ملاحظہ ہو بیان عدالت) معلوم نہیں کہ ان میں سے کس کا بیان صحیح ہے۔

میری طرف بھی آتا ہے:

آمد نزد من جبرئیل علیہ السلام و مرا برگزید۔ (مواہب الرحمٰن ص۶۳)

یعنی وحی بھی آگئی اور جبرئیلؑ بھی۔ اس کے بعد دین کے متعلق دیکھئے۔ اخبار الفضل مورخہ ۳ر فروری ۱۹۳۵ء میں لکھا ہے:

اللہ تعالیٰ نے اس آخری صداقت کو قادیان کے ویرانہ میں نمودار کیا ..... اور فرمایا کہ جو دین تو لیکر آیا ہے اسے تمام دیگر ادیان پر بذریعہ دلائل و براہین غالب کروں گا۔

یہ دین مسلمانوں کے دین سے بالکل الگ تھا، چنانچہ میرزا محمود احمد صاحب نے اپنے خطبۂ جمعہ منقولہ الفضل مورخہ ۳۰ر جولائی ۱۹۳۱ء میں فرمایا:

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ یہ غلط ہے کہ دوسرے لوگوں سے ہمارا اختلاف صرف وفات مسیح یا اور چند مسائل میں ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات، رسول کریم صلعم، قرآن، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔ غرضیکہ آپ نے تفصیل سے بتایا کہ ایک ایک چیز میں ہمیں ان سے اختلاف ہے۔

یعنی وحی بھی ملی۔ جبرئیل بھی نازل ہوئے اور ایک نیا دین بھی ملا جو مسلمانوں کے دین سے بالکل مختلف تھا۔ اب رہا سوال امت بنانے کا تو اخبار الفضل مورخہ ۲۶ر جنوری ۱۹۱۶ء میں لکھا تھا کہ

مرزا صاحب نے فرمایا کہ پہلا مسیح صرف مسیح تھا اس لئے اس کی امت گمراہ ہوگئی اور موسوی سلسلہ کا خاتمہ ہوا۔ اگر میں بھی صرف مسیح ہوتا تو ایسا ہی ہوتا۔ لیکن میں مہدی اور محمد کا بروز بھی ہوں اس لئے میری امت کے دو حصے ہوں گے۔ ایک وہ جو مسیحیت کا رنگ اختیار کرینگے اور یہ تباہ ہو جائیں گے۔ دوسرے وہ جو مہدویت کا رنگ اختیار کریں گے۔

یعنی ان کی ایک امت بھی بنی۔ (واضح رہے کہ مرزا محمود صاحب نے عدالت میں اب یہ کہا ہے کہ احمدی الگ امت نہیں ہیں۔ معلوم نہیں کہ مرزا صاحب کا ارشاد صحیح تھا یا خلیفہ صاحب کا)۔

یہاں تک آپ نے دیکھ لیا کہ شروع میں مرزا صاحب نے جتنی باتوں کا خود انکار کیا تھا بعد میں ان میں سے ایک ایک کا دعویٰ کرتے چلے گئے۔ ایک مستقل نبی بنے، الگ دین لائے، الگ امت بھی بنائی، لیکن کیا یہ کہ اپنے اس دین کا نام اسلام اور اس دین کے ماننے والوں کا نام مسلمان رکھا اور اس سے انکار کرنے والوں کو کافر اور دائرہ اسلام سے باہر قرار دیا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

خدائے تعالیٰ نے میرے پر ظاہر کیا ہے کہ ہر ایک وہ شخص جس کو میری دعوت پہنچی ہے اور اس نے قبول نہیں کیا وہ مسلمان نہیں ہے۔ (الذکر الحکیم ص۲۵)

اور ان کے خلیفۂ ثانی میاں محمود احمد صاحب آئینۂ صداقت ص۳۵ پر لکھتے ہیں کہ

کل مسلمان جو حضرت مسیح موعودؑ کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے خواہ انہوں نے حضرت مسیح موعودؑ کا نام بھی نہیں سنا وہ کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔

مرزا صاحب نے اپنی تحریروں میں بعض جگہ غیر احمدیوں کو مسلمان بھی کہا ہے۔ اس سے یہ شبہ گذر سکتا تھا کہ وہ غیر احمدیوں کو مسلمان سمجھتے تھے اس شبہ کے ازالہ کیلئے صاحبزادہ بشیر احمد صاحب نے کلمۃ الفصل میں لکھا ہے کہ

> یہ ایک یقینی بات ہے کہ حضرت مرزا صاحب نے جہاں کہیں بھی غیر احمدیوں کو مسلمان کہہ کر پکارا ہے وہاں صرف یہ مطلب ہے کہ وہ اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں ورنہ آپ حسبِ حکمِ الٰہی اپنے منکروں کو مسلمان نہ سمجھتے تھے۔

اور اخبار الفضل اس کی مزید تشریح کرتا ہوا لکھتا ہے کہ ان تحریروں میں

> مسلمان کا لفظ بلحاظ قوم ہے اور شرعی فتویٰ جو کسی نبی کے انکار سے لازم آتا ہے وہ اور بات ہے۔ (مورخہ ۱۸ اپریل ۱۹۲۵ء)

یہی نہیں کہ مرزا صاحب خود نبی بن گئے بلکہ یہ بھی کہا کہ ان کے بعد اب وہ شخص نبی بن سکے گا جو ان کی اتباع کریگا۔ چنانچہ مرزا محمود صاحب اس باب میں فرماتے ہیں کہ

> اب کوئی ایسا نبی نہیں آسکتا جو یہ کہے کہ وہ رسول کریمؐ سے بلاواسطہ تعلق پیدا کرکے نبی بن سکا۔ حضرت مسیح موعود فرماتے ہیں، میری اتباع کے بغیر کسی کو قربِ الٰہی حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس آئندہ خواہ کوئی نبی ہو اس کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر ایمان لانا ضروری ہے۔　　(الفضل مورخہ ۷ مئی ۱۹۳۳ء)

ضمناً یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ دوسرے مقام پر یہ بھی لکھا ہے کہ مرزا صاحب کے بعد اب کوئی نبی آہی نہیں سکتا۔ چنانچہ رسالہ تشحیذ الاذہان بابت مارچ ۱۹۱۴ء میں لکھا ہے کہ

> پس ثابت ہوا کہ امتِ محمدیہ میں سے ایک سے زیادہ نبی کسی صورت میں بھی نہیں آسکتے۔ چنانچہ نبی کریم صلعم نے اپنی امت میں سے صرف ایک نبی اللہ کے آنے کی خبر دی ہے جو مسیح موعود ہے۔ . . . . اس امت میں نبی صرف ایک ہی آسکتا ہے جو مسیح موعود ہے اور قطعاً کوئی نہیں آسکتا۔

حالانکہ اب یہی مرزا محمود صاحب اپنے بیانِ عدالت میں فرماتے ہیں کہ مرزا صاحب جیسے اور انبیاء کے آنے کا امکان ہے۔

قلتِ گنجائش مانع ہے ورنہ ہم اس قسم کے بیشمار اور اقتباسات بھی پیش کر سکتے تھے جن سے واضح ہوتا ہو کہ مرزا صاحب کے اس دعوے نے کس طرح ایک نیا دین اور نئی امت پیدا کی ہو اور اس کے ساتھ ہی اس التباس کو بھی شامل رکھا ہو کہ اس نئے دین کا نام اسلام اور اس نئی امت کا نام مسلمان ہو۔ پھر آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ ان حضرات کی تحریروں میں کسقدر باہمی تضاد ہے۔ تضادِ بیان ہمیشہ ذہنی انتشار اور نفسیاتی کشمکش کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہو کہ اس قسم کے دعوے جان بوجھ کر مفاد پرستی کی خاطر کئے جاتے ہیں، لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ دماغی خلل یا نفسیاتی عارضہ کا نتیجہ ہوتے ہیں اور دنیاوی مفاد ان کے ساتھ خود بخود آجاتے ہیں۔ یہ دعاوی، شعوری طور پر (دیدہ و دانستہ) کئے جائیں یا غیر شعوری طور پر، دونوں صورتوں میں اس کا ذمہ دار وہی بنیادی عقیدہ ہو جس کی طرف ہم شروع میں اشارہ کر چکے ہیں۔ یعنی یہ عقیدہ کہ رسول اللہ صلعم کے بعد بھی لوگوں کو خدا کی طرف سے کشف یا الہام ہو سکتا ہے۔ قرآن سے اس عقیدہ کی کوئی سند نہیں ملتی۔ اور جب یہ بنیادی عقیدہ ہی غیر قرآنی ہے تو اس پر اٹھی ہوئی تمام عمارت بھی غیر قرآنی ہے یعنی خود رسول اللہ صلعم کی وحی کے متعلق یہ عقیدہ کہ ایک وحی قرآن میں محفوظ ہو اور دوسری وحی (یعنی الہامِ نبوی) احادیث کی شکل میں موجود ہے۔ پھر رسول اللہ صلعم کے بعد امام منصوص کا عقیدہ، مامورین من اللہ کا عقیدہ، مجددین، مہدی اور مسیح موعود کا عقیدہ، اولیاء اللہ کا عقیدہ، کہ انہیں خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے، علمِ باطنی کا عقیدہ جس پر تصوف کی بنیاد قائم ہے، یہ تمام عقیدے غیر قرآنی ہیں۔ لیکن ان سب کی سندیں حدیثوں سے مل جاتی ہیں۔ لہٰذا، اگر اس قسم کے دعاوی کے متعلق حدیثوں کی رو سے بحث کی جائے

تو آپ کسی فریق کو بھی شکست نہیں دے سکتے۔ آپ کو موافق اور مخالف ہر قسم کی حدیثیں ملتی چلی جائیں گی۔ خود مرزائیت کے فروغ کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس کے متعلق حدیثوں کی رو سے بحث کی جاتی ہے۔ ہمارے مولوی صاحبان کی حالت یہ ہے کہ وہ حدیثوں کو دین کا جزو قرار دیتے ہیں اور جب حدیثوں کی رو سے پیدا شدہ فتنے سامنے آتے ہیں تو اس پر واویلا مچاتے ہیں۔ خود ہی ایک آنے والے کیلئے مسند بچھا دیتے ہیں اور جب کوئی اس مسند پر آکر بیٹھ جاتا ہے تو خود ہی اس کے پیچھے لٹھ لیکر پڑ جاتے ہیں۔ ان تمام فتنوں کا علاج ایک ہی ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے دین کی سند بنایا ہے (یعنی قرآن) اسکو دین کی سند سمجھا جائے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ یہ تمام فتنے خود بخود مٹ جائیں گے۔ ہم نے اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ چیلنج دیا ہے اور آج اس چیلنج کو پھر دہراتے ہیں کہ مرزا صاحب نے جتنے بھی دعوے کئے ہیں ان میں سے کسی دعوے کو بھی قرآن کی رو سے ثابت کیا جائے۔ قرآن کی رو سے یہ حضرات ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے۔ قرآن زندگی کے مذاق نہیں کرتا، محکم حقائق پیش کرتا ہے جس دن مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ دین کی سند صرف قرآن ہے اسی دن ان کی گاڑی صحیح پٹڑی پر چڑھ جائے گی۔

---

(۲) یتیم پوتے کی وراثت

گزشتہ اشاعت میں ہم نے لکھا تھا کہ پنجاب اسمبلی میں ایک مسودۂ قانون بدیں مضمون پیش ہوا ہے کہ یتیم پوتے کو دادا کی وراثت سے حصہ ملنا چاہیے۔ اس کے متعلق اسمبلی مذکور نے عوام سے آراء طلب کی تھیں۔ ہمیں یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ حلقۂ طلوع اسلام نے اس قرآنی مسئلہ کی نشر و اشاعت میں اچھی سرگرمی دکھائی ہے۔ لیکن ان کا کام ابھی ختم نہیں ہو جاتا جبتک اسمبلی کے آئندہ سیشن میں یہ مسودہ پیش نہیں ہو لیتا اس جدوجہد کو برابر جاری رکھنا چاہیے۔ یہ مسئلہ اتنا ہی نہیں ہے کہ یتیم پوتے کو وراثت ملنی چاہیے۔ بلکہ بنیادی سوال یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو غیر قرآنی قوانین رائج ہو چکے ہیں انھیں ہر وقت قرآنی قوانین سے بدلا جا سکتا ہے۔ ملا کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہو رہی ہے اس کا کہنا یہ ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے اسے بدلنے کا کسی کو حق نہیں۔ خواہ وہ قرآن کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس مسودۂ قانون سے یہ بنیادی سوال حل ہو جائے گا کہ ایک غیر قرآنی قانون کو قرآن کے مطابق بنایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ لہٰذا ہم ان تمام حضرات سے نہایت تاکید سے درخواست کرینگے جو چاہتے ہیں کہ ہمارے قوانین قرآن کے مطابق بن جائیں کہ وہ اس کوشش میں پورا پورا حصہ لیں۔ عوام کو اس مسئلہ سے آگاہ کریں۔ پنجاب اسمبلی کے ممبروں سے اس باب میں گفتگو کریں۔ طلوع اسلام نے اس بارہ میں جو پمفلٹ شائع کیا ہے اسے عوام اور خواص ہر ایک طبقہ میں پہنچایا جائے۔ ہمیں امید ہے کہ ان کی یہ کوششیں بار آور ہوں گی اور مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا دن ہوگا جب ایک غیر قرآنی قانون، قرآن کے مطابق بنایا جائے گا۔ اور یہ فیصلہ آئندہ کے لئے بھی راستہ کو صاف کر دے گا۔ قرآن اس کا انتظار کرتا ہے کہ اس کے ماننے والے اس باب میں کیا کچھ کرکے دکھاتے ہیں۔

نوٹ: ہم نے اس وقت تک مذکورۂ صدر مسودۂ قانون کے صرف اتنے حصہ کا ذکر کیا ہے جس میں یتیم پوتے کو حصہ دلانے کا ذکر ہے۔ ہم اس پورے مسودہ کی نقل حاصل کر رہے ہیں۔ اس کے باقی ماندہ حصہ کے متعلق اگر کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو آئندہ پرچہ میں لکھ دیا جائے گا۔

تقدیرِ امم کیا ہے؟

پرویز

قرآن کی تعلیم کا ماحصل یہ ہے کہ انسانوں کو دنیا میں اس طرح رہنا چاہئے کہ کوئی انسان اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہ جائے، اور ہر فرد کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی چلی جائے۔ تاکہ وہ اس دنیا کی زندگی بھی عزت اور آرام سے گذارے اور اس کے بعد کی زندگی میں حیاتِ جاوداں کی اہلیت حاصل کرلے۔ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے ایک عملی پروگرام دیتا ہے جسے نظامِ ربوبیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن اس نظام کا ضابطۂ ہدایت ہے۔

کسی نظام کے پرکھنے کے تین ہی طریقے ہوسکتے ہیں۔ یا تو اس پر عملی نقطۂ نگاہ سے غور کیا جائے، ان بنیادوں کو کائناتی حقائق کی روشنی میں پرکھا جائے جن پر وہ اپنی عمارت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مختلف اجزاء کو انسانی تقاضوں کے نقطۂ نگاہ سے جانچا اور تولا جائے۔ انسانی اسباب و وسائل کے پیشِ نظر اس کے ممکن العمل ہونے پر غور کیا جائے اور اس طرح علمی اور نظری رو سے دیکھا جائے کہ جو دعویٰ وہ نظام پیش کرتا ہے وہ صحیح ہوسکتا ہے یا نہیں۔

نظام کے پرکھنے کے طریقے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس نظام کو عملی شکل اختیار کرلینے دی جائے اور اس کے بعد دیکھا جائے کہ اس کے نتائج اس کی صداقت کی دلیل بنتے ہیں یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقِ عمل وقت طلب ہوگا اس لئے کہ کوئی نظام بھی ہو اسے اپنے نتائج مرتب کرنے کیلئے مہلت کے وقفہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

اگر کوئی شخص کسی نظام پر نہ تو عملی طور پر غور و فکر کرے اور نہ ہی اس کے نتائج مرتب ہونے تک کا انتظار کرنے پر راضی ہو، تو اس کیلئے تیسری شکل یہی ہوسکتی ہے کہ اسے بتایا جائے کہ تاریخ کے سابقہ ادوار میں جب اور جہاں کہیں اس قسم کے نظام کو قائم کیا گیا، اس کے نتائج کیا نکلے؟ اس طریقِ عمل کو دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں تاریخ کی سائنس (SCEINCE OF HISTORY) کہا جائے گا۔ یعنی وہ طریق جس کی رو سے تاریخ کو ایک سائنس کی حیثیت دی جاتی ہے جس سے یہ بتایا جاتا ہے کہ انسانی تاریخ میں جہاں جہاں فلاں نہج کی زندگی بسر کی گئی اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ لہٰذا اس کے بعد جہاں بھی اس نہج کا نظام قائم ہوگا اس کے نتیجے بھی ویسے ہی برآمد ہوں گے۔ یعنی یہ وہ استقرائی طریق ہے جس سے ماضی کے واقعات سے مستقبل کے نتائج پر شہادت پیش کی جاتی ہے۔ اس طریقِ عمل کو ہمارے زمانہ میں خاص اہمیت حاصل ہو رہی ہے۔

قرآن نے اپنے نظام کی صداقت کو پرکھنے کے لئے ان تینوں طریقوں کو پیش کیا ہے۔ وہ اپنے معترضین کے متعلق کہتا ہے کہ بل کذّبوا بما لم یحیطوا بعلمہٖ یہ اسے اس لئے غلط سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس اتنا علم نہیں جس سے یہ اس نظام کی صداقت کو علمی اور نظری طور پر پرکھ سکیں۔ ولمّا یأتھم تأویلہٗ اور نہ ہی ابھی اس نظام کے ٹھوس نتائج ان کے سامنے آئے ہیں۔ کیونکہ ابھی اس نظام کی تشکیل کی ابتدا ہے اور

اس کے نتائج ایک وقت کے بعد جاکر برآمد ہوں گے سو اس کے بعد اس کے سوا چارۂ کار نہیں کہ ان سے کہا جائے کہ نہ یہ نظام نیا ہے اور نہ ہی اس کی تکذیب پہلی مرتبہ ہوئی ہے۔ کذٰلك کذب الذین من قبلھم۔ اس سے پہلے بھی جن لوگوں کے سامنے اس قسم کا نظام پیش کیا گیا انھوں نے اس کی تکذیب کی اور اس کے خلاف زندگی بسر کرتے رہے۔ فانظر کیف کان عاقبۃ الظالمین (۱۰/۷۳) سو تم تاریخ کے اوراق سے پوچھو کہ جن لوگوں نے اس نظام سے سرکشی برت کر ایسے نظام کو اختیار کیا تھا جس میں حقوق انسانیت کی کمی ہوتی تھی ان لوگوں کا انجام کیا ہوا؟ ان قوموں کی اجڑی ہوئی بستیاں تمہیں بتادیں گی کہ وہ لوگ تباہ و برباد ہوگئے۔ لہٰذا اگر تم بھی اس نظام کی مخالفت کروگے تو تمہارا انجام بھی ایسا ہی ہوگا۔

ان طریقوں کی جامعیت

آپ غور کیجئے کہ قرآن نے اپنے دعوے کے پرکھنے کے جو تین طریقے تجویز کئے ہیں کیا انسانی علم ان پر کوئی اضافہ کرسکا ہے؟ ان تینوں طریقوں میں تینوں زمانے سمٹ کر آجاتے ہیں۔ تاریخی شواہد زمانۂ ماضی کو اپنے آغوش میں لے لیتے ہیں۔ علمی اور نظری تحقیق زمانۂ حال کو محیط ہوتی ہے اور استنتاجی طریق (نتائج سے دعوے کو پرکھنے کا طریقہ) زمانۂ مستقبل پر حاوی ہوجاتا ہے۔ آخر الذکر طریق (یعنی استنتاجی طریقہ) تو وہ ہے جس کے متعلق مخالفین سے اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ فانتظروا انی معکم من المنتظرین۔ تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ نتائج خود بخود بتادیں گے کہ میرا دعویٰ سچا ہے یا نہیں۔ لیکن باقی دونوں طریقوں کے لئے قرآن دلائل پر دلائل اور نظائر پر نظائر پیش کرتا چلا جاتا ہے۔ علمی دلائل کے لئے وہ کائناتی نظام کو پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تم اس پر غور کرکے دیکھو کہ وہ تمہیں کس نتیجہ تک پہنچاتا ہے۔ تسخیر ارض و سماء، تقدیر شمس و قمر، تکویر لیل و نہار جن کا ذکر قرآن اس تکرار سے کرتا ہے، کائناتی نظام ہی کے شواہد ہیں جنھیں وہ بطور دلائل و براہین پیش کرتا ہے۔ یا ان سے نیچے اتر کر سطح ارض، اس پر بلند و بالا پہاڑ،

کائناتی نظام سے دلائل

سمندر اور دریا، ان پر تیرنے والی کشتیاں اور جہاز، انھیں چلانے والی ہوائیں، لہلہاتی کھیتیاں، گھنے گھنے باغات، فضا میں اڑنے والے پرندے، خشکی پر چلنے والے مویشی، یا خود انسان کا نظام طبعی۔ ان تمام امور کو قرآن بطور علمی دلائل کے پیش کرتا ہے۔ دوسری طرف آپ دیکھیں گے کہ اس نے اقوام سابقہ کے احوال و کوائف کو کس قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن وہ ان حالات و ماجریات کو تاریخی واقعات کی حیثیت سے پیش نہیں کرتا اس لئے کہ اس کا مقصود وقائع نگاری نہیں۔ وہ

تاریخی شواہد

انھیں اپنے نظام کی صداقت کے لئے بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ اگر آپ اس حقیقت کو سامنے رکھکر ان تاریخی شواہد کا مطالعہ کریں گے تو آپ کے سامنے قرآن اور تاریخ دونوں کے ایسے ایسے گوشے بے نقاب ہوجائیں گے جو اس سے پہلے شاید آپ کی نظروں سے پوشیدہ تھے۔

ان تاریخی شواہد سے قرآن کا مقصد ایک اور بھی ہے۔ وہ جہاں معترضین اور مخالفین سے کہتا ہے کہ اگر تم نے اس نظام کی مخالفت کی تو تمہارا انجام بھی وہی ہوگا جو ان لوگوں کا ہوا جنھوں نے اس سے پہلے اس کی مخالفت کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس پارٹی کو جو اس نظام کو عملاً نافذ کرنے کے ارادہ سے اٹھتی ہے، کہتا ہے کہ تم اچھی طرح سے سمجھ لو کہ اس سے پیشتر جب اور جہاں اس قسم کی انقلابی جماعت اٹھی تھی اسے کس کس قسم کی مشکلات سے واسطہ پڑا تھا۔ کس کس نہج سے اس کی مخالفت ہوئی تھی۔ کس کس قسم کی قوتیں ان کی راہ میں حائل ہوئی تھیں۔ انھوں نے اس تحریک کے خلاف کون کون سے حربے استعمال کئے تھے۔ اس انقلابی جماعت نے کس طرح ان تمام مخالفتوں کی مدافعت کی تھی۔ مخالفین کے

اعتراضات کا کیا جواب دیا تھا اور کس انداز سے ان کے حربوں کو بیکار کر کے اپنے نظام کو متشکل کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ وہ زمانۂ ابتدائے تاریخ سے اس کش مکش کو بیان کرنا شروع کرتا ہے اور ان جزئیات کو چھوڑ کر جن کا تعلق کسی خاص زمانہ یا خاص مقام سے تھا، ان عناصر کو الگ کر لیتا ہے جو ہر زمانہ اور ہر قوم میں بطور قدر مشترک پائے جاتے ہیں۔ وہ ان مشترک عناصر کو یہ کہہ کر پیش کرتا ہے کہ دنیا میں جب اور جہاں بھی اس انقلاب کی آواز اٹھے گی، اس اس قسم کی ذہنیتیں اس کی مخالفت کے لئے آگے بڑھیں گی۔ لہٰذا ہر اس جماعت کو جو اس نظام کے قیام کی تمنا لیکر اٹھے سمجھ لینا چاہئے کہ اسے کس کس نوعیت کی مخالفتوں سے سابقہ پڑتا ہے آئندہ اوراق میں ہم ان مشترک عناصر کا اجمالی سا تذکرہ کریں گے جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ قرآنی انقلاب کے مقابلہ میں پوری شدت کے ساتھ میدان میں آجائیں گے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ جو لوگ آج بھی قرآنی نظام کو عملاً متشکل دیکھنا چاہتے ہیں انھیں معلوم ہو جائے کہ اس آواز کی مخالفت کس کس گوشے سے ہوگی اور انھیں اس کی مدافعت کیلئے کیا کچھ کرنا ہوگا۔ اس کے بعد یہ بھی بتایا جائیگا کہ اس جماعت کی جدوجہد کے نتائج کس شکل میں برآمد ہوں گے اور مخالفین کی کوششیں کس طرح خاسر و خائب رہیں گی۔ یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جائیگی کہ قرآن کی رُو سے قوموں کے استخلاف و استبدال (SUCCESSION AND SUBSTITUTION) کے قوانین کیا ہیں اور وہ کس طرح بلا رُو رعایت کارفرما رہتے ہیں۔

مذہبی پیشواؤں کا گروہ

اصولاً قرآن نے یہ بتایا ہے کہ چونکہ قرآنی انقلاب کے پیش نظر تمام نوع انسانی کا اجتماعی مفاد ہوتا ہے اس لئے اس کی مخالفت ان لوگوں کی طرف سے ہوتی ہے جن کا مقصد صرف انفرادی مفاد ہوتا ہے۔ ان میں اکثر و بیشتر وہ لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں کی کمائی پر جیتے ہیں۔ اس گروہ میں سب سے پہلے مذہبی پیشواؤں کا گروہ آتا ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جو اپنی مفاد پرستی کے لئے اپنے ذہن سے مسائل تراشتا ہے اور انھیں خدا کے دین کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ (الذین یکتبون الکتٰب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ) اور اس سے ان کا مقصد اپنی مفاد پرستی ہوتا ہے۔ لیشتروا بہ ثمنا قلیلا (۲/۷۹) تاکہ اس طریق سے کچھ پیسے کما لئے جائیں۔ سورۂ یونس میں اسی کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے، قل ان الذین یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون متاع فی الدنیا..... (۱۰/۶۹-۷۰) ان سے کہدو کہ جو لوگ اپنے خود ساختہ خیالات کو خدا کا دین بنا کر پیش کرتے ہیں انھیں کچھ دنیاوی مفاد تو حاصل ہو سکتے ہیں لیکن وہ آخر الامر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ قرآنی انقلاب کی سب سے پہلی مخالفت اس گروہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کو یہ کہکر بھڑکاتے ہیں کہ دیکھو یہ شخص کہتا ہے کہ تم جس مذہب پر چلے آرہے ہو وہ غلط ہے حالانکہ یہ وہ مذہب ہے جس پر تمہارے بڑے بڑے مقدس بزرگ کاربند تھے اور جو تمہیں تمہارے اسلاف کی طرف سے ملا ہے۔ قرآن نے ایک ایک رسول کی دعوت کے سلسلہ میں مذہب پرست طبقہ کے پیشواؤں کی طرف سے اس مخالفت کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعد ان کی اس دلیل کی مختلف انداز سے تردید کی ہے۔ جب حضرت نوحؑ نے خدائی نظام کو اپنی قوم کے سامنے پیش کیا تو اس کے جواب میں ان سے یہی کہا گیا ما سمعنا بھذا فی اٰبائنا الاولین (۲۳/۲۴) ہم نے اپنے اسلاف سے اس قسم کی باتیں کبھی نہیں سنیں۔

تاریخ کے مشترک عناصر

اسلاف پرستی

اس لئے ہم تمہاری بات کو نہیں مانتے۔ یہی بات قوم ثمود نے حضرت صالحؑ سے کہی کہ اتنھٰنا ان نعبد ما یعبد اٰباؤنا (۱۱/۶۲) کیا تو ہمیں ان کی عبودیت سے روکتا ہے جن کی عبادت ہمارے آباؤ اجداد سے ہوتی چلی آرہی ہے؟ جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ ان مٹی کی مورتیوں کی کیا حقیقت ہے جن کے ساتھ تم اس طرح چمٹے ہوئے ہو، تو اس کے جواب میں انھوں نے بھی یہی کہا کہ وجدنا اباءنا لھا عابدین (۲۱/۵۳) ہم نے اپنے اسلاف کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے، اس لئے ہم بھی اسی روش پر چلتے ہیں۔ جب حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم اپنی اس غلط روش کو چھوڑ دو تو انھوں نے بھی اس کے جواب میں یہی کہا کہ اصلوٰتک تامرک ان نترک ما یعبد اباءنا (۱۱/۸۷) کہ اے شعیب! کیا وہ نظام صلوٰۃ جسے تو پیش کرتا ہے تجھ سے یہ کہتا ہے کہ ہم ان چیزوں کی عبودیت چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے آباؤ اجداد سے ہوتی چلی آرہی ہے؟ جب صاحب ضرب کلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے ارکان سلطنت کے سامنے خدا کے دین کو پیش کیا تو انھوں نے بھی جواب میں یہی کہا کہ اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَیْہِ اٰبَاءَنَا (۱۰/۷۸) کیا تو ہمارے پاس اسلئے آیا ہے کہ تو ہمیں اس مذہب سے ہٹا دے جس پر ہمارے آباؤ اجداد چلتے آرہے ہیں؟

یہی جواب اس داعیٔ انقلاب صلعم کو ملا جو خدا کے مکمل دین کو نوع انسانی کے سامنے آخری مرتبہ پیش کرنے کیلئے آیا تھا۔ اس سے بھی یہی کہا گیا کہ ما سمعنا بھذا فی الملۃ الاٰخرۃ ان ھذا الا اختلاق (۳۸/۷) ہم نے یہ کچھ اپنے سابقہ مذہب میں کہیں نہیں سنا۔ لہٰذا یہ خدا کا دین نہیں۔ اس شخص کا خود ساختہ مذہب ہے۔

مختصراً یہ کہ قرآن کے بیان کے مطابق دنیا میں جب اور جہاں بھی کسی نے وحی کے نظام کو پیش کیا تو مذہبی پیشواؤں کے اس طبقہ نے جو دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرنے کا عادی ہو چکا تھا یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ یہ روش ہمارے آباؤ اجداد کے مسلک کے خلاف ہے۔ یہ اس مذہب کے خلاف ہے جو بزرگوں کی طرف سے ہمارے یہاں چلا آرہا ہے اسلئے ہم اسے ماننے کیلئے تیار نہیں۔

وکذٰلک ما ارسلنا من قبلک فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا انا وجدنا اباءنا علیٰ امۃ وانا علیٰ اٰثارھم مقتدون۔ (۴۳/۲۳)

اور اسی طرح ہم نے جس بستی کی طرف بھی کسی رسول کو بھیجا تو وہاں کے مفت خوروں نے یہی کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ ہم نے جس روش پر اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے۔ ہم اسی پر چلتے جائیں گے۔

اسلاف پرستی کی مخالفت

قرآن نے ان لوگوں کی اس "دلیل" کی قدم قدم پر مخالفت کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ اپنی عقل و فکر سے کام نہیں لیتے اور اندھوں کی طرح آنکھیں بند کئے دوسروں کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی گردن میں اس قسم کے طوق پڑ جاتے ہیں جو ان کے سر کو اوپر اٹھائے رکھتے ہیں اور وہ اس طرح اپنے سامنے کا راستہ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ رفتہ رفتہ ان کے آگے اور پیچھے دیواریں کھنچ جاتی ہیں۔ ان کی عقل و فکر پر پردے پڑ جاتے ہیں اور انھیں کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ (۳۶/۸-۹) یہی وہ جہنم کا ایندھن ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا ولھم اٰذان لا یسمعون بھا (۷/۱۷۹) انھیں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت تو عطا ہوتی ہے لیکن یہ اس سے سوچنے سمجھنے کا

کام نہیں لیتے۔ ان کی آنکھیں تو ہوتی ہیں لیکن یہ ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن یہ ان سے سنتے نہیں۔ اولئک کالانعام بل ھم اضل۔ یہ بالکل حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ غلط زندگی۔ اسلئے کہ حیوانات کو ذرائع علم حاصل نہیں ہوتے اور ان کی یہ حالت ہے کہ ان ذرائع کو رکھتے ہوئے غلط راستہ پر چلے جاتے ہیں۔ اولئک ھم الغٰفلون (۷/۱۷۹)۔ وہ کہتا ہے کہ سلف سے تمہارا اتنا ہی تعلق ہے کہ تلک امۃ قد خلت یہ لوگ اپنا اپنا وقت گذار کر دنیا سے چلے گئے لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم جو کچھ انھوں نے کیا اس کے نتائج ان کے لئے ہیں اور جو کچھ تم کرو گے اس کے نتائج تمہارے لئے ہوں گے ولا تسئلون عما کانوا یعملون (۲/۱۳۴) تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے اسلاف کیا کیا کرتے تھے۔ تم سے یہی پوچھا جائے گا کہ تم نے کونسی راہ اختیار کی تھی۔ وہ کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ جب تمہارے سامنے کوئی معاملہ پیش ہو تو یہ نہ دیکھو کہ وہ اس روش کے مطابق ہے یا نہیں جو اسلاف سے تمہارے پاس وراثۃً چلی آرہی ہے۔ تم خود علم و عقل سے کام لو اور سوچو کہ وہ معاملہ صحیح ہے یا غلط۔ ولا تقف ما لیس لك بہ علم جس بات کا تمہیں خود علم نہ ہو اس کے پیچھے مت چلو۔ علم حاصل کرنے کے لئے اپنی بصارت اور سماعت سے کام لو اور معاملہ پیش نظر کو جذبات سے ہٹ کر سمجھو اور پرکھو۔ اس لئے کہ ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسئولا تمہارے خارجی ذرائع علم اور تمہارے جذبات ہر ایک سے پوچھا جائیگا کہ تم نے صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لئے کیا کیا تھا۔

قرآن کا اندازِ تحقیق اس مقام پر ضمناً اتنا بتا دینا بھی ضروری ہے کہ قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ محسوسات پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے اور وہاں سے جو نتائج مرتب ہوں ان سے اپنے پیش کردہ اصولوں پر دلیل لاتا ہے۔ برعکس فلسفیانہ انداز کے جس میں مجرد نظریات سے بحث کی جاتی ہے اور اس طرح اصول مرتب کر کے انھیں محسوسات کی دنیا کی طرف لایا جاتا ہے، مثلاً قرآن کہتا ہے کہ وما کان لنفس ان تؤمن الا باذن اللہ۔ قرآن کے بیان کردہ اصولوں اور اس نظام کے ان دیکھے نتائج پر کوئی شخص ایمان نہیں لا سکتا تاوقتیکہ وہ خدا کے قانون کے مطابق نہ چلے۔ اور خدا کا وہ قانون یہ ہے کہ ویجعل الرجس علی الذین لا یعقلون۔ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے ان کے سامنے معاملات کبھی صاف نہیں ہوتے مشتبہ رہتے ہیں (۱۰/۱۰۰) اس کے بعد وہ بتاتا ہے کہ عقل و فکر سے کام لینے کا طریقہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قل انظروا ماذا فی السموات والارض ان سے کہو کہ کائنات کے اس محیر العقول کارخانہ پر غور کرو اور وہاں سے جو نتائج حاصل ہوں ان کی رو سے یہ سوچو کہ انسانی زندگی کے متعلق جو قوانین وحی کے ذریعے دیئے گئے ہیں وہ حقائق پر مبنی ہیں یا نہیں۔ یعنی قرآن، کائنات کے محسوس نظام پر غور و فکر کی دعوت دیکر یہ کہتا ہے کہ اس سے تم جن نتائج پر پہنچو ان کی رو سے اس نظام کی صداقت کو پرکھو جو انسانی معاشرہ کے لئے اس نے متعین کیا ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔ لیکن سردست انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اس ضمن میں ایک نکتہ اور بھی قابل غور ہے۔ یوں تو وہ کون ہے جو اشیائے کائنات کو دیکھتا نہیں۔ چاند، سورج، ستارے، دریا، پہاڑ، درخت، زمین، سب کی آنکھوں کے سامنے ہیں لیکن قرآن اس دیکھنے کو دیکھنا نہیں کہتا۔ وہ "نظر" اور "بصر" کے لطیف فرق کو نمایاں طور پر بیان کرتا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے، وتراھم ینظرون الیك وھم لا یبصرون (۷/۱۹۸) نظر بظاہر ایسا معلوم ہوگا کہ یہ لوگ تیری طرف دیکھ رہے ہیں

لیکن یہ صرف ماتھے کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، نگہ بصیرت سے نہیں دیکھ رہے۔ دوسرے مقام پر اس کی اور بھی وضاحت کر دی جہاں کہا کہ ومنھم من یستمعون الیک۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے متعلق گمان یہی گذرتا ہے کہ وہ تیری باتوں کو سن رہے ہیں لیکن وہ درحقیقت سن نہیں رہے ہوتے۔ وہ بہرے ہوتے ہیں کیونکہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔ (افأنت تسمع الصم ولو کانوا لا یعقلون) اس سے آگے ہے کہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے متعلق ہر دیکھنے والا یہی کہے گا کہ وہ تیری طرف دیکھ رہے ہیں لیکن وہ اندھے ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ بصیرت سے کام نہیں لیتے۔ (ومنھم من ینظر الیک افأنت تھدی العمی ولو کانوا لا یبصرون ﴿۱۰/۴۳﴾) لہذا قرآن کی دعوت یہ ہے کہ اس کے پیش نظر قوانین سے یونہی انکار نہ کر دو۔ ان کا علم کی رو سے احاطہ کرو۔ (۱۰/۳۹) لیکن وہ کہتا ہے کہ ان مذہبی پیشواؤں کا مسلک یہ ہے یہ کبھی علم و عقل سے کام نہیں لیں گے۔ ان کے سامنے جب کوئی ایسی بات پیش کی جائے گی جو ان کے مروجہ عقیدہ کے خلاف ہو تو یہ اس کے سننے سے پہلے ہی اس سے انکار کر دیں گے اور برملا کہدیں گے کہ ہم اسے ماننے کیلئے تیار نہیں۔ فما کانوا لیؤمنوا بما کذبوا بہ من قبل (۱۰/۷۴) اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے اور سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ کذلک نطبع علی قلوب المعتدین (۱۰/۷۴)

لہذا جو جماعت اس خیال کو لیکر اٹھے کہ وہ قرآنی نظام کو عملاً تشکیل کرے گی تو اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس آواز کی مخالفت سب سے پہلے مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہو گی۔ ان کے پاس ایک ہی دلیل ہو گی کہ جو مسلک ہمارے آباؤ اجداد سے چلا آتا ہے وہی صحیح ہے اس کے خلاف ہم ایک لفظ بھی سننے کیلئے تیار نہیں۔ چونکہ یہ طبقہ عوام کے سطحی جذبات کو بہت جلد بھڑکا سکتا ہے اسلئے ان کی مخالفت کا مقابلہ بڑے سکون و ثبات سے کرنا ہو گا اور جو طریقہ قرآن نے تجویز کیا ہے اس سے ان کی مدافعت کی جائے گی۔

دوسرا گروہ

قرآنی انقلاب کی مخالفت میں دوسرا گروہ وہ آگے بڑھے گا جو خالص مفاد پرستوں کا گروہ کہلاتا ہے۔ قرآن میں ان کیلئے دو اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔ ایک مترفین اور دوسری مَلَأٌ ــــ مترفین سے مراد ایسے لوگ ہیں جو خود کچھ نہ کریں اور دوسروں کی کمائی پر عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں۔ دور حاضرہ کی اصطلاح میں انھیں سرمایہ پرستوں کا گروہ کہا جائے گا۔ دوسری اصطلاح مَلَأٌ ہے جس کے لغوی معنی ہیں ایسے لوگ جن کے گھروں میں برتن بھرے ہوئے ہوں یعنی جن کے ہاں کھانے پینے کو بافراط ہو۔ اس سے مراد وہ لیڈر ہیں جو ذاتی جوہروں اور صلاحیتوں کی بنا پر نہیں بلکہ محض اس لئے لیڈر بن جاتے ہیں کہ ان کے ہاں کھانے پینے کو بافراط موجود ہوتا ہے۔ چونکہ قرآنی نظام ربوبیت میں نہ سرمایہ داروں کے لئے گنجائش ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس قسم کے لیڈروں کیلئے۔ لہذا ان کی طرف سے اس نظام کی مخالفت ضروری ہوتی ہے۔ یہی ہوتا رہا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ چنانچہ جب حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کے سامنے خدائی نظام کی دعوت پیش کی تو

سرمایہ پرست اور لیڈر

قال الملأ من قومہ انا لنرٰک فی ضلال مبین (۷/۶۰) اس کی قوم کے بڑے بڑے لیڈروں نے کہا کہ ہمارے خیال میں تو غلط راستے پر چل رہا ہے۔ دوسرے مقام پر ہے کہ ان لیڈروں نے کہا ما نرٰک اتبعک الا الذین ھم اراذلنا کہ جو لوگ تیرے پیچھے لگ گئے ہیں وہ ہمارے ہاں کے رذیل طبقہ کے لوگ ہیں (کیونکہ وہ غریب تھے اور دولت مندوں کی

نگاہ میں ہر غریب ذلیل اور رذیل ہوتا ہے۔ شرافت تو صرف دولت سے وابستہ ہوتی ہے!) اسلئے انھوں نے کہا کہ وما نری لکم علینا من فضل (11/27) تم لوگوں کو معاشی خوشحالیوں میں بھی ہمارے مقابلہ میں کوئی برتری حاصل نہیں ہے اس لئے نظنکم کاذبین ہم تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں۔ یعنی چونکہ تم لوگوں کے پاس مال و دولت نہیں ہے اسلئے تمہارے ساتھ کوئی "شریف آدمی" شامل نہیں ہو سکتا۔ سورۃ المومنون میں اس حقیقت کو یہ کہکر اور بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ ان ارباب دولت و ثروت نے اس دعوت سے انکار کیا اور مستقبل کی خوش حالیوں کے تصور کو جھٹلایا اسلئے کہ اترفناھم فی الحیوۃ الدنیا (23/33) ہم نے انھیں دنیاوی زندگی میں بڑی آسودگی عطا کر رکھی تھی۔

اسی طرح جب حضرت ہودؑ نے اس دعوت کو پیش کیا تو قال الملأ الذین کفروا من قومہ اس کی قوم کے ان لیڈروں نے جو اس کی دعوت کا انکار کرتے تھے کہا کہ انا لنرٰیک فی سفاھۃ ہمارے خیال میں تو ایک احمق سا آدمی ہے وانا لنظنک من الکٰذبین (7/66) اور ہم تمہیں بالکل جھوٹا سمجھتے ہیں۔

اسی طرح جب حضرت صالحؑ نے قوم ثمود کے سامنے اس دعوت کو پیش کیا تو قال الملأ الذین استکبروا من قومہ للذین استضعفوا لمن اٰمن منھم۔ اس کی قوم کے ان لیڈروں نے جنھیں بڑی قوت اور ثروت حاصل تھی ان غریبوں اور کمزوروں سے کہا جو حضرت صالح پر ایمان لے آئے تھے کہ اتعلمون ان صالحا مرسل من ربہ (7/75) کیا تم فی الواقعہ اسے صحیح تسلیم کرتے ہو کہ صالح اپنے خدا کی طرف سے بھیجا ہوا رسول ہے؟

حضرت شعیبؑ کو ان سے بھی زیادہ سخت دھمکی دی گئی قال الملأ الذین استکبروا من قومہ اس کی قوم کے مستبد اور سرکش ارباب قوت نے اس سے کہا لنخرجنک یا شعیب والذین اٰمنوا معک من قریتنا او لتعودن فی ملتنا (7/88) کہ اے شعیب ہم یا تو تجھے اور یہ جو تیری جماعت میں شامل ہو گئے ہیں ان سب کو پھر سے اپنے مذہب میں واپس لے آئیں گے اور اگر تم اس پر راضی نہیں ہو گے تو انھیں یہاں سے نکال باہر کریں گے۔ آپ نے غور کیا کہ مفاد پرستوں کا یہ گروہ جن کے ہاتھ میں زمام اقتدار ہوتی ہے آسمانی نظام کی مخالفت میں کن حربوں پر اتر آتا ہے۔

سرمایہ پرستوں کی طرف سے مخالفت

جو کچھ اقوام سابقہ کی طرف بھیجے ہوئے داعیانِ انقلاب کے ساتھ ہوا وہی کچھ نبی اکرم صلعم کے ساتھ ہوا ہے۔ چنانچہ سورۃ ص میں ہے کہ جب حضورؐ نے اس دعوت کو پیش کیا تو وانطلق الملأ منھم ان امشوا واصبروا علیٰ اٰلھتکم ان ھذا لشیء یراد (38/6) اس قوم کے بڑے بڑے سرداروں نے لوگوں سے کہا کہ تم جاؤ اپنا کام کرو۔ اس کی بات مت سنو، اور اپنے معبودوں کی پرستش پر بدستور جمے رہو۔ ہمیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ یہ شخص کچھ اور ہی ارادے باندھ چکا ہے۔ جو کچھ یہ کہتا ہے ہم نے ایسی باتیں اپنے اسلاف سے کبھی نہیں سنیں۔ یہ سب اس کی اپنی بنائی ہوئی باتیں ہیں۔ (38/7) بھلا دیکھو تو! ہم میں یہی شخص رہ گیا تھا جس کی طرف خدا وحی بھیجتا؟ ءاُنزل علیہ الذکر من بیننا (38/8) خدا کو اگر وحی بھیجنی تھی تو مکہ اور طائف کے کسی بڑے آدمی کی طرف بھیجی ہوتی ——— (وقالوا لولا نزل ھذا القراٰن علی رجل من القریتین عظیم) (43/31)

سورۃ مزمل میں ہے کہ اس دعوت کی تکذیب کرنے والے وہی لوگ تھے جنھیں دنیاوی آسائشیں حاصل تھیں (المکذبین اولی النعمۃ 73/11) یعنی وہ جعلت لہ مالا ممدودا) جسے ہم نے کثرت سے دولت دے رکھی تھی (وبنین شھودا) اور جوان بیٹے جو اس دعوت کی مخالفت

میں اپنی پوری پوری قوت صرف کرتے تھے۔ (و مھدت لہ تمھیداً) اور جسے زندگی کی تمام ہمواریاں میسر تھیں (۷۴/۱۲-۱۴) یہ وہ سرمایہ پرست تھے جن کی حالت یہ تھی کہ الذی یدع الیتیم ولا یحض علیٰ طعام المسکین (۱۰۷/۲-۳) جو ان لوگوں کو دھکے دیتے تھے جو معاشرہ میں بے یار و مددگار رہ گئے تھے۔ اور ان لوگوں کے کھانے پینے کے انتظام کا کوئی خیال نہیں کرتے تھے جن کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا تھا اور وہ کمانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جن کی ہمیشہ کوشش ہوا کرتی تھی کہ رزق کے جن سرچشموں کو اللہ نے نوع انسانی کی پرورش کے لئے کھلا رکھا ہے ان پر بند لگا کر انھیں اپنی ملکیت قرار دے لیں۔ ویمنعون الماعون (۱۰۷/۷)

یہ ہے سرمایہ پرستوں اور ارباب اقتدار کا وہ طبقہ جس کی طرف سے خدائی نظام کی ہمیشہ مخالفت ہوتی رہی ہے۔ قرآن نے تاریخ کے ان شواہد کو اپنے آغوش میں اس لئے محفوظ رکھا ہے تاکہ جو لوگ نزول قرآن کے بعد اس نظام کی دعوت کو لیکر اٹھیں انھیں معلوم ہو جائے کہ اس کی مخالفت اس طبقہ کی طرف سے بھی ہوگی اور بڑی شدید ہوگی۔

عوام اور لیڈر

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس نظام کی مخالفت مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہو یا ارباب دولت اور صاحبانِ اقتدار کی طرف سے، وہ اس مخالفت پر بہر حال عوام ہی کو ابھاریں گے تو اس باب میں ذمہ داری کس پر عائد ہوگی؟ عوام پر یا ان کے لیڈروں پر۔ قرآن نے اس سوال پر بھی اپنے خاص انداز میں گفتگو کی ہے۔ وہ تمثیلی انداز یہ ہے کہ لیڈر اور ان کے متبعین جہنم میں جمع ہیں اور وہ ایک دوسرے کو مطعون کرتے ہیں کہ تمہاری وجہ سے یہ تباہی اور بربادی آئی۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے یوم ندعوا کل اناس باماھم (۱۷/۷۱) اس دن عوام کو ان کے مذہبی پیشواؤں اور لیڈروں کے ساتھ بلایا جائیگا۔ اور سورۂ سبا میں ہے کہ یہ عوام جو محکوم اور کمزور تھے ان ارباب اقتدار و حکومت سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم اس نظام خداوندی کی دعوت کو ضرور قبول کر لیتے۔ یہ لیڈر جواب میں کہیں گے کہ یہ غلط ہے۔ ہم نے تمہیں صحیح راستہ پر چلنے سے کبھی نہیں روکا تھا۔ تمہاری اپنی ہی نیت خراب تھی۔ اس لئے تم خود ہی مجرم ہو۔ وہ لوگ ان لیڈروں سے کہیں گے کہ آج تم ہم سے کہتے ہو کہ مجرم ہم ہی تھے۔ تم بالکل بے گناہ تھے۔ حالانکہ تمہاری حالت یہ تھی کہ تم دن رات اس قسم کی اسکیمیں بنایا کرتے تھے اور ایسے ایسے قوانین مرتب کیا کرتے تھے جن سے ہم مجبور ہو جاتے تھے کہ نظام خداوندی کا انکار کریں اور انسانوں کے خود تراشیدہ قوانین کو خدا کے قانون کے برابر سمجھیں۔ (۳۴/۳۱-۳۳)

اسی طرح سورۂ ابراہیم میں ہے کہ یہ عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ تم ہمیں جس طرح کہتے تھے ہم وہی کچھ کیا کرتے تھے لہٰذا تمہارا یہ فریضہ ہے کہ اس عذاب سے ہم کو نجات دلاؤ۔ وہ کہیں گے کہ اگر ہم خود سیدھے راستہ پر ہوتے تو تمہیں بھی سیدھے راستہ پر لے چلتے۔ اب چیخنے چلانے سے کچھ حاصل نہیں۔ یہ تباہیاں تمہارے اور ہمارے سب کے لئے یکساں ہیں۔ اب فرار کی کوئی راہ نہیں۔ (۱۴/۲۱)

بڑی اور چھوٹی قومیں

صرف عوام اور ان کے لیڈروں ہی کے متعلق نہیں بلکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ دنیا میں بعض قومیں اتنی بڑی پوزیشن حاصل کر لیتی ہیں کہ چھوٹی چھوٹی قومیں ان کے پیچھے چلنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اس نے عوام اور لیڈروں کے باہمی طعن و تشنیع کے علاوہ ان قوموں کی باہمی گفتگو کا بھی تمثیلی تذکرہ کیا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ جب جہنم میں ایک قوم داخل ہوگی تو

وہ اس قوم پر لعنت بھیجے گی جس کے ساتھ اس نے رابطۂ اتحاد و اخوت قائم کر رکھا تھا۔ اس وقت یہ کمزور قومیں (جو بڑی بڑی قوموں کے پیچھے چلا کرتی تھیں) خدا سے کہیں گی کہ یہ بڑی بڑی قومیں وہ ہیں جنھوں نے ہمیں بھی گمراہ کیا تھا۔ لہٰذا فاتھم عذابا ضعفا من النار۔ انھیں دوگنا عذاب دیجئو۔ ایک عذاب ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے اور دوسرا اس لئے کہ انھوں نے ہمیں بھی گمراہ کیا تھا۔

اس کے جواب میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ عبرت و بصیرت کے ہزار سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ محکوم اور کمزور (عوام ہوں یا اقوام) ہمیشہ ارباب قوت کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ لیکن ان ارباب اقتدار کی قوت کا راز بھی تو یہی عوام ہوتے ہیں۔ لیڈروں کے پاس اور کوئی قوت نہیں ہوتی۔ اگر عوام ان کے پیچھے چلنا چھوڑ دیں تو لیڈروں کی لیڈری اسی وقت ختم ہو جائے۔ لہٰذا اگر غلط کار لیڈروں کا جرم یہ ہے کہ وہ عوام کو بھی غلط راستہ پر لیجاتے ہیں تو عوام کا جرم یہ ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے ان لیڈروں کے پیچھے چلتے رہتے ہیں اور اس طرح ان کی اس قوت کا موجب بنتے ہیں جس کے سہارے ان کی لیڈری قائم ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن میں ہے کہ جب یہ پیچھے چلنے والے کہیں گے کہ ان لیڈروں کو دوہرا عذاب دے تو جواب ملے گا لکل ضعف ولکن لا تعلمون (۷/۳۸) ان لیڈروں ہی کو نہیں بلکہ ان کے ساتھ تمہیں بھی دوہرا عذاب ملے گا۔ ان بڑی بڑی قوموں ہی کو نہیں بلکہ ان کے پیچھے چلنے والی چھوٹی چھوٹی قوموں کو بھی دوگنا عذاب دیا جائے گا۔ انھیں اُن کا جرم تو بڑا بن کر دکھائی دے رہا ہے لیکن اپنے جرم کی طرف ان کی نگاہ ہی نہیں اٹھتی!

اپنے مذہبی پیشواؤں اور سیاسی لیڈروں کا یہ رویہ دیکھکر عوام ان سے سخت بیزار ہو جائیں گے اور کہیں گے لوان لنا کرۃ فنتبرأ منھم کما تبرؤا منا کہ اگر کہیں ایک مرتبہ ایسا ہو کہ ہم پھر دنیا میں واپس چلے جائیں تو جس طرح انھوں نے ہم سے آج آنکھیں پھیر لی ہیں تو ہم بھی اُن سے اسی طرح آنکھیں پھیر لیں۔ پھر انھیں پتہ چلے کہ لیڈری کس بھاؤ بکتی ہے! لیکن ان کی یہ حسرتیں ان کے دل ہی میں رہیں گی۔ موقعہ ہاتھ سے نکل چکا ہوگا۔ وہ وقت دوبارہ نہیں آئے گا۔ (کذلک یریھم اللہ اعمالھم حسرات علیھم وما ھم بخارجین من النار (۲/۱۶۶-۱۶۷) لیکن متبعین کی یہ حسرت پوری ہو یا نہ ہو، ان لیڈروں کو بہرحال دوگنا بوجھ اٹھانا ہی ہوگا۔ لیحملوا اوزارھم کاملۃ یوم القیامۃ ومن اوزار الذین یضلونھم بغیر علم ... (۱۶/۲۵ نیز ۲۹/۱۳)

خلاصۂ مبحث

بہرحال، بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ جب نظام خداوندی کی انقلابی دعوت پیش کی جاتی ہے تو اس کی مخالفت کن کن گوشوں سے ہوتی ہے۔ ہم نے دیکھ لیا کہ قرآن نے اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ یہ مخالفت ان لوگوں کی طرف سے ہوتی ہے جن کے سامنے نوع انسانی کے مشترکہ مفاد کے بجائے اپنا ذاتی مفاد ہوتا ہے۔ اس گروہ کی تین شاخیں ہیں۔

(۱) مذہبی مقتداؤں کا طبقہ جو لوگوں کو یہ کہہ کر قانونِ خداوندی سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ روش اس مذہب کے خلاف ہے جو تمہارے اسلاف سے تمہارے پاس چلا آرہا ہے۔ قرآن اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ دین میں سند صرف خدا کی وحی ہے اس لئے تم اپنے دعوے کی تائید میں وحی کی سند پیش کرو۔ اور یہ کہ میری دعوت علم و یقین کی دعوت ہے اور یہ دلائل و براہین پر مبنی ہے اسلئے علم و عقل سے اس پر غور کرو۔ اور پھر بتاؤ کہ تمہیں اس میں کیا غلطی نظر آتی ہے۔

(۲) دوسرا گروہ سرمایہ پرستوں کا ہے جو اس انقلاب کی اس لئے مخالفت کرتا ہے کہ اس میں ہر شخص کو خود کما کر کھانا پڑتا ہے۔ کسی شخص کو دوسروں کی کمائی پر جینے کا حق حاصل نہیں ہوتا۔

(۳) تیسرا گروہ ان ارباب اقتدار و حکومت کا ہوتا ہے جو معاشرے کو اپنے خود ساختہ قوانین کے ماتحت رکھنا چاہتے ہیں۔ چونکہ نظام خداوندی میں حاکم اور محکوم کا سوال ہی نہیں ہوتا اور عزت کا معیار وراثتی دولت کے بجائے ذاتی جوہر ہوتا ہے اس لئے یہ گروہ اس نظام کی مخالفت کرتا ہے اور عوام کو اس کے خلاف ابھارتا ہے۔ بنیر بڑی بڑی قومیں بھی اس کی مخالفت کرتی ہیں کیونکہ اس میں قومی مفاد کی جگہ نوع انسانی کا عالمگیر مفاد مدنظر ہوتا ہے۔

اس انقلاب کے نتائج کیا ہوتے ہیں؟ جو لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں انھیں عذاب کس شکل میں ملتا ہے؟ کونسی قومیں تباہ ہوتی ہیں اور عروج کسے ملتا ہے؟ ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کس طرح لے لیتی ہے؟ قرآن نے ان امور کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے جسے آئندہ اقساط میں پیش کیا جائے گا۔

دیکھئے۔ اپنا خریداری نمبر تلاش کیجئے

فروری ۱۹۵۴ء کی اس اشاعت کے ساتھ آپ حضرات کا چندہ (جن کے نمبر خریداری درج ذیل ہیں) ختم ہو گیا ہے۔ لہذا آئندہ ماہ مارچ ۱۹۵۴ء کا پرچہ آپ کی خدمت میں وی پی بھیجا جائے گا۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو ۲۰ فروری ۱۹۵۴ء سے پہلے پہلے آپ اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمادیں کہ اس میں ادارہ کو سہولت اور آپ کو کفایت ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے خدانخواستہ آپ رسالہ کی خریداری آئندہ جاری رکھنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں تو ۲۰ فروری سے پہلے پہلے ادارہ کو اپنے اس فیصلہ سے مطلع فرمادیں ورنہ ادارہ کی طرف سے مرسلہ وی پی کو وصول فرمانا آپ کا اخلاقی فریضہ ہوگا۔

فہرست خریداران جن کا چندہ ختم ہو گیا ہے

۵۲ — ۲۴۶ — ۲۵۵ — ۳۰۲ — ۳۰۸ — ۴۳۸ — ۴۶۹ — ۴۷۴ — ۴۷۹ — ۴۸۸ — ۶۹۲ — ۶۹۴ — ۷۰۵

۷۳۲ — ۷۵۴ — ۷۵۶ — ۷۵۸ — ۷۶۱ — ۷۶۷ — ۷۷۰ — ۷۷۸ — ۷۸۳ — ۷۹۲ — ۷۹۴ — ۷۹۹ — ۸۲۳

۸۲۴ — ۸۲۵ — ۸۳۱ — ۸۴۴ — ۸۴۸ — ۱۰۷۴ — ۱۱۰۴ — ۱۱۰۵ — ۱۱۷۷ — ۱۲۵۳ — ۱۲۵۴ — ۱۲۵۶ — ۱۲۶۵

۱۳۰۰ — ۱۳۲۶ — ۱۳۴۲ — ۱۳۴۳ — ۱۳۴۸ — ۱۳۴۹ — ۱۳۵۰ — ۱۳۵۴ — ۱۳۵۵ — ۱۳۵۷ — ۱۳۵۸ — ۱۳۵۹ — ۱۳۶۰

۱۳۶۱ — ۱۳۶۳ — ۱۳۶۴ — ۱۳۶۵ — ۱۳۷۴ — ۱۳۸۱ — ۱۳۸۷ — ۱۳۸۸ — ۱۴۴۹ — ۱۴۳۸ — ۱۵۴۵ — ۱۶۰۳ —

طاہرہ کے نام

ہاں بیٹی! تمہاری سہیلی رشیدہ بالآخر چل بسی۔ تمہیں اس پر حیرت ہے کہ وہ اتنی سی عمر میں مرکس طرح گئی اور مجھے اس پر تعجب ہے کہ وہ اتنے دنوں تک جیتی کیسے رہی؟ اس کی عمر بمشکل اکیس بائیس برس کی ہوگی۔ پانچ چھ برس ہوئے جب اس کی شادی ہوئی تھی۔ مجھے شروع ہی سے محسوس ہوتا تھا کہ کوئی غم ہے جو اُسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ معلوم کرنے کی بھی کوشش کی لیکن اس نے اپنے دل کی کھڑکی کو اس بری طرح سے مقفل کر رکھا تھا کہ اس کے اندر کوئی بھی جھانک نہ پایا۔ دو تین برس تو اس نے اس طرح گنا لئے لیکن اس کے بعد اس کی چپ اس کے غم کی پردہ داری نہ کر سکی۔ اس کے چہرے کی افسردگی۔ اس کی آنکھوں کی اداسی۔ اس کی رنگت کی زردی۔ اس کا کھویا کھویا پن یہ سب مل کر اس کے دل کی گہرائیوں کے غماز بنتے چلے جا رہے تھے۔ یہ سب کچھ اندر ہی اندر ہو رہا تھا لیکن اس نے اس پر بھی اپنی زبان نہ کھولی۔ پھر ہلکا ہلکا تپ رہنے لگ گیا۔ اب معلوم ہوا کہ اُس آتشِ خاموش نے اس کے مغز استخواں تک کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ بس اسی میں وہ چل بسی!

رشیدہ بڑی سمجھدار بچی تھی۔ معاملہ فہم۔ سلیقہ شعار۔ اپنی عمر کی لڑکیوں سے کہیں زیادہ سنجیدہ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بڑی حساس۔ تیرہ چودہ برس کی ہوگی کہ اس کے باپ نے مولوی صاحب سے یہ مسئلہ سن لیا کہ جب لڑکی جوان ہو جائے تو اس کے ہاتھ کا پانی پینا حرام ہو جاتا ہے جب تک اس کی شادی نہ کر دی جائے۔ لہٰذا اب اس کے باپ کے سامنے سوال یہ نہیں تھا کہ اس کے لئے موزوں رشتہ کونسا ہوگا۔ سوال یہ تھا کہ اسے گھر سے دھکا دیکر باہر کیسے نکالا جائے تاکہ "حرام کا پانی پینے" کے گناہِ عظیم سے بچ جائے! اس "شرعی ضرورت" کے ماتحت بیٹی کو گھر سے وداع کرنے کی فکر باپ کے سر پر سوار ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں لوگ بڑی بڑی عمر تک لڑکیوں کو گھر میں بٹھا رکھا کرتے تھے کیونکہ ان کی شادی کرنے سے انھیں کسی کا سُسر بننا پڑتا تھا اور سسر بننا ان کے نزدیک بڑی ذلت اور بے شرمی کی بات تھی، تو کسی مصلحت بیں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ معاشرہ سے اس تباہ کن رسم کو ختم کیا جائے۔ اس کے لئے اس نے یہ بات چلا دی۔ اور چونکہ لوگوں پر "شرعی مسئلہ" کا زیادہ اثر ہوتا ہے اس لئے اس نے یہ کہدیا کہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ جوان بیٹی کے ہاتھوں سے پانی پینا حرام ہو جاتا ہے جب تک اس کی شادی نہ کر دی جائے۔ اس نے تو یہ کچھ "نیک نیتی" سے کیا ہوگا لیکن اسے کیا معلوم کہ اس "دروغ مصلحت آمیز" کا بالآخر نتیجہ کیا نکلے گا؟ تم حیران ہوگی طاہرہ! کہ ہمارے ہاں جو اس قدر جھوٹی حدیثیں وضع ہوتی ہیں تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لوگ جس بات کو نیک خیال کرتے تھے اسے معاشرہ میں رائج کرنے کے لئے، اس کی تائید میں ایک حدیث وضع کر لیتے تھے اور اس طرح اپنے خیال کو رسول اللہؐ کی حدیث بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے تھے تاکہ اس کا اثر زیادہ ہو۔ ہمارے ہاں موضوعات (یعنی وضعی۔ جھوٹی۔ حدیثوں کی کتابوں) میں اس قسم کے بہت سے واقعات لکھے ہیں کہ فلاں بزرگ نے قرآن کی سورتوں کی فضیلت میں بیشمار

حدیثیں وضع کیں اور جب لوگوں نے ان سے پوچھا تو انھوں نے بلا تکلف اقرار کرلیا کہ یہ حدیثیں میں نے بنائی ہیں تاکہ لوگوں کو قرآن کی طرف رغبت دلاؤں۔ چنانچہ ہمارے ہاں جو اصلاحی مسائلِ شریعت عام طور پر رائج ہیں (بالخصوص عورتوں کے مسائل) ان کے بیشتر حصہ نے اسی طرح سے "شرعی حیثیت" اختیار کر رکھی ہے۔ بہر حال، یہ تھا وہ "شرعی مسئلہ" جس کے ڈر سے رشیدہ بچاری کے باپ نے جلد از جلد اس فریضہ سے سبکدوش ہونے کی دل میں ٹھانی۔

یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ ہمارے گھروں میں اور ہر قسم کی باتیں کھلے کھلے کی جاسکتی ہیں لیکن رشتہ ناطہ کے متعلق تجویزوں کو بڑے راز میں رکھا جاتا ہے اور اس کی تو خاص طور پر احتیاط کی جاتی ہے کہ جس لڑکی کی شادی کا مسئلہ درپیش ہے اس کے کان میں اُس کی بھنک تک نہ پڑنے پائے۔ چنانچہ رشیدہ کے ماں باپ بھی لڑکی کے رشتے کے متعلق آپس میں کھُسر پھُسر کرتے رہتے۔ محلے میں شدہ شدہ کچھ باتیں بھی نکلتی رہتیں۔ لیکن رشیدہ سے سب کچھ راز میں رکھا جاتا۔ لیکن اگر اسے یقینی طور پر بھی معلوم ہو جاتا (اور خواہ معلوم بھی اپنی ماں سے ہو جاتا) تو بھی اس سے کیا فرق پڑتا؟ یہ ناممکن تھا کہ وہ یہ کہدیتی کہ مجھے فلاں رشتہ ناپسند ہے۔ ہمارے ہاں اگر کوئی لڑکی اپنے رشتہ کے متعلق ایک لفظ بھی زبان تک لے آئے تو "باغیرت" باپ اس "بے حیا" کا گلا گھونٹ دے۔ لہذا اس کا سوال ہی نہ تھا کہ اس کے رشتہ کی تجویزوں کو رشیدہ سے خفیہ رکھا جاتا تھا یا اسے اس کا علم ہو جاتا تھا۔ البتہ جس جگہ اس کے رشتے کی بات ٹھہرائی جارہی تھی وہ اسے دل سے ناپسند تھی۔ مگر اس سے بھی کیا فرق پڑتا تھا۔ ہمارے ہاں لڑکیوں کو شروع ہی سے یہ سبق دیا جاتا ہے کہ روحیں تو ازل کے دن ہی سے جوڑ دی جاتی ہیں۔ اس لئے جس جس روح کا آپس میں جوڑ ہوتا ہے ان کا رشتہ ہو کر رہتا ہے۔ ہر ایک کے ماتھے کا لکھا اس کی جھولی میں پڑتا ہے۔ لیکھ کی ریکھ مٹائی نہیں جاسکتی۔ یہ بندھن تو آسمانوں پر بندھ جاتے ہیں۔ اصلی نکاح تو فرشتوں نے پہلے ہی سے پڑھا دیا ہوتا ہے۔ زمین پر محض رسم پوری کی جاتی ہے۔ یہ تمام باتیں "شریعت کے مسائل" کی حیثیت سے ہمارے ہاں بیان ہوتی ہیں اسلئے رشتہ میں انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

رشیدہ بڑی سمجھدار لڑکی تھی اس لئے وہ محسوس کرتی تھی کہ یہ چیزیں غلط ہیں۔ اس نے کئی بار چاہا کہ اپنی ماں سے اس کے متعلق بات کرے لیکن اس نے جب بھی کچھ کہنے کی کوشش کی، کوئی چیز تھی جو اس کے گلوگیر ہو جاتی تھی اور وہ پھر خاموش کی خاموش رہ جاتی تھی۔

تم جانتی ہو طاہرہ! یہ چیز کیا تھی جو یوں اس کے گلوگیر ہو جاتی تھی؟ یہ تھا وہ بھوت جسے ہم نے "ضمیر کی آواز" کا نام دیکر اتنا مقدس بنا رکھا ہے کہ اس کے فیصلے خدا کے فیصلے اور اس کا حکم آسمان کا حکم سمجھا جاتا ہے اور جسے ہر معاملہ میں غلط اور صحیح کا معیار قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس "مقدس آواز" کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ ہماری تعلیم۔ تربیت۔ ماحول۔ عقائد وغیرہ کے مجموعی اثرات کا نتیجہ ہوتی ہے جو چپکے چپکے آہستہ آہستہ بچپن سے ہمارے دل کی گہرائیوں میں نقش ہوتا رہتا ہے اور بالآخر پختگی حاصل کر کے ایک خاص شکل اختیار کرلیتا ہے۔ تمہیں یاد ہے کہ امرتسر میں تمہارے پڑوس میں جو جینی رہا کرتے تھے، ان کے بچوں کو گوشت کا نام سن کر قے ہو جاتی تھی حالانکہ اسی عمر کا تمہارا جاوید دن بھر ہڈی چوستا رہتا تھا۔ جینیوں کے بچے کی ضمیر کی آواز کہتی تھی کہ گوشت ناپاک شے اور بہت بری چیز ہے لیکن ہمارے جاوید میاں کی ضمیر اسے گوشت کھانے پر کبھی ملامت نہیں کرتی تھی۔ یہ تھی وہ "ضمیر کی آواز" جو رشیدہ کو ہراساں کر ڈراتی تھی کہ تو لڑکی — اور ایک مسلمان لڑکی — ہو کر اپنے رشتے کے متعلق لب کشائی کرتی ہے! اگر طاہرہ! اس کے سامنے کبھی قرآن کی تعلیم ہوتی تو وہ غلط تربیت، غلط تعلیم، غلط ماحول اور غلط عقائد کی اس آواز کو

(جسے وہ ضمیر کی آواز سمجھتی تھی) جھٹک کر الگ کر دیتی اور کہہ دیتی کہ جب میرے خدا کا حکم ہے کہ نکاح، لڑکے اور لڑکی کی باہمی رضامندی ہی سے ہو سکتا ہے تو اس کے خلاف جو آواز بھی اٹھے گی وہ خدائی حکم سے سرکشی کی آواز ہوگی۔ خواہ وہ آواز باہر سے آئے یا انسان کے اپنے سینے ہی سے اٹھے۔ دنیا میں آواز صرف ایک ہے جس میں کسی غلطی اور گمراہی کا امکان نہیں۔ اور وہ آواز ہے خدا کی آواز جو قرآن کے الفاظ میں محفوظ ہے۔

اِدھر یہ ہو رہا تھا اور اُدھر حمید کے ہاں بھی اس کی شادی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اگرچہ اس باب میں حمید کی بھی یہ پوزیشن نہیں سمجھی جاتی تھی کہ اس سے اس کی شادی کے متعلق مشورہ کیا جائے لیکن اس سے یہ تجاویز اس طرح پوشیدہ نہیں رکھی جاتی تھیں جس طرح ایک لڑکی سے مخفی رکھی جاتی ہیں۔ حمید بھی سمجھدار لڑکا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے کہدیا کہ ہمارے حالات ایسے ہیں کہ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی چاہیے۔ ابا جان ایک عرصے سے بیمار چلے آتے ہیں اور کچھ کمانے کے قابل نہیں۔ میری تنخواہ بہت قلیل ہے اور سارے گھر کا اسی پر گذارہ ہے۔ اول تو شادی کے اخراجات کے لئے جو روپیہ قرض لیا جائے گا اس کی ادائیگی کی کوئی صورت نہیں ہوگی، پھر اُس آنے والی کا بھی تو کچھ خرچ پڑے گا یہ تمام اخراجات اس تنخواہ سے کس طرح نکل سکیں گے؟ گرانی کا زمانہ ہے۔ اخراجات دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس لئے ابھی اس شادی کے سوال کو رہنے دو۔

ماں نے یہ کچھ سنا تو ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ بیٹا! لوگ سچ کہتے تھے کہ لڑکے کو کالج میں نہ بھیجو۔ وہاں کی تعلیم اچھے بھلے مسلمان بچوں کو بے دین بنا دیتی ہے۔ میں اسے نہیں مانتی تھی۔ لیکن مجھے اب ماننا پڑا کہ وہ سچ کہتے تھے۔ حمید بیٹا! تجھے تو خدا پر ذرہ برابر بھی ایمان نہیں رہا کیا تو اسے رازق نہیں مانتا جو ایسے حساب کرنے بیٹھ گیا ہے؟ یہ کہاں سے آئیگا؟ وہ کہاں سے آئے گا؟ یعنی جس خدا نے پیدا کیا ہے اسے ہمارے رزق کی فکر ہی نہیں؟ وہ خدا جو پتھر میں کیڑے کو بھی رزق پہنچاتا ہے، ہمیں رزق نہیں دے گا؟ بیٹا! توبہ کرو۔ خدا سے معافی مانگو۔ تمہارے دل میں یہ کیسے خیالات آنے لگ گئے! وہ آنے والی آئے گی تو اپنا رزق ساتھ نہیں لائے گی؟ تمہاری یا میری کیا حیثیت ہے جو ہم کسی کو کھانے کو دیں۔ سب کو وہ خدا کھانے کو دیتا ہے۔ جس کی قسمت میں جو کچھ لکھا ہے وہ اسے مل کر رہے گا۔ ہماری قسمت کو ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ اور اگر ہماری تقدیر میں غریبی لکھی ہے تو اسے کوئی امیری سے نہیں بدل سکتا۔ اگر خدا نے ہماری قسمت میں فاقے لکھ دیئے ہیں تو ہمیں فاقوں سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ خدا کے نیک بندے وہ ہیں جو قسمت پر شاکر رہتے ہیں۔ اس سے انسان کے دل میں قناعت پیدا ہوتی ہے اور قناعت ایسی دولت ہے جو خدا کے خاص خاص بندوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ بڑے بڑے پیر پیغمبر، بڑے بڑے قطب اور ولی بڑے بڑے خدا رسیدہ بزرگ، ان کے حالات پڑھو اور دیکھو کہ ان پر اللہ کی طرف سے کس قدر مصیبتیں آئیں لیکن انھوں نے ان سب کو برداشت کیا۔ ان کے پاس نہ کھانے کو روٹی تھی نہ پہننے کو کپڑا۔ نہ رہنے کو مکان نہ بچھانے کو بستر۔ لیکن انھوں نے خدا پر توکل رکھا اور اپنی تقدیر پر شاکر رہے۔ اللہ نے انھیں بڑے بلند مرتبے عطا کر دیئے۔ حضرت ایوبؑ خدا کے بڑے پیارے بندے تھے۔ ان کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ سارے بدن میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ جب کوئی کیڑا ان کے جسم سے نیچے گر جاتا تو وہ اسے اٹھا کر پھر اپنے زخموں میں رکھ لیتے اور کہتے کہ اگر تو زمین پر رہ گیا تو تجھے کھانے کو کہاں سے ملے گا! اللہ نے ان کے صبر کا اجر دیا اور ان کو اپنا رسول بنا لیا۔ یہ ہے بیٹا! خدا پر سچا ایمان۔ تمہارے دل میں

شیطان نے وسوسہ ڈال دیا ہے جو تم سوچنے لگ گئے ہو کہ شادی کرالی تو اس تنخواہ میں گذارا کیسے ہوگا! جن لوگوں کی تنخواہیں نہیں لگی ہوئیں انھیں بھی تو کہیں سے رزق ملتا ہی ہے! کیا ہمارے رسول خدا کی تنخواہ لگی ہوئی تھی؟

حمید کی ماں ایک ہی سانس میں اتنا کچھ کہہ گئی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کی کس کس بات کا جواب دے۔ اس نے بات کو ختم کرنے کیلئے کہا کہ "امی جان! میں تو صرف اتنا ہی کہتا ہوں کہ ابھی شادی نہ کرو۔ تھوڑے دن اور ٹھہر جاؤ۔ جب میری تنخواہ بڑھ جائے یا کم از کم حمید کے کالج کا خرچ نہ رہے اور وہ بھی کچھ کمانے کے قابل ہو جائے، اس وقت شادی کر دینا۔ میں شادی سے انکار تھوڑا کر رہا ہوں!

اس کی ماں نے بات کاٹتے ہوئے کہا کہ بیٹا! اچھے رشتے روز روز نہیں ملا کرتے۔ یہ تو محض خدا کی طرف سے ہے جو اس نے بہن صابرہ کے دل میں یہ بات ڈال دی ہے، ورنہ ہم اس قابل تھے کہ رشیدہ جیسی لڑکی ہمیں مل جاتی؟ شکل سے چاند کا ٹکڑا۔ عقل دیکھو تو سو ہزار میں ایک۔ پڑھی لکھی۔ سمجھدار۔ سلیقے والی۔ جس دن سے اس نے گھر کا کام کاج سنبھالا ہے۔ اس گھر کا نقشہ بدل گیا ہے۔ دور دور سے عورتیں دیکھنے آتی ہیں۔ ایسی لڑکی کہیں سے مل سکتی ہے؟ اور پھر پیر جی عبدالصمد کہتے تھے کہ اس کا ستارہ بڑا نیک ہے۔ جس گھر میں اس کا قدم پڑ جائے گا وہ گھر جنت بن جائے گا۔ میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر کرتی ہوں کہ میری بہن نے میری بات کی لاج رکھ لی اور تم کہتے ہو کہ ابھی شادی نہ کرو۔ ٹھہر جاؤ۔ بھلا سوچو تو، اس کا باپ تمہاری خاطر بیٹی کو گھر بٹھا رکھے گا کہ تمہاری ترقی ہو جائے تو پھر شادی کرے خواہ اتنے میں بیٹی کا سر سفید ہو جائے؟

حمید کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ اس کا باپ ہانپتے کانپتے کمرے میں آ گیا اور بیوی سے پوچھا کہ کیا بات ہے جس پر جھگڑا ہو رہا ہے؟ بیوی نے بتایا تو اس نے کہا کہ حمید بیٹا! میں تو صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ میری بیماری اتنی بڑھ چکی ہے کہ معلوم نہیں مجھے کتنے دن اور جینا ہے۔ دل میں اب ایک ہی آرزو ہے اور وہ یہ کہ مرنے سے پہلے تمہارا سہرا باندھ لوں۔ بس اس کے بعد میں اطمینان کی موت مروں گا کیا تم اپنے بیمار اور بوڑھے باپ کی یہ آخری آرزو بھی پوری نہ کرو گے؟

حمید نے کچھ کہنا چاہا تو باپ نے غصے میں آ کر کہا کہ حمید! آخری بات یہ ہے کہ یہ میرا حکم ہے۔ بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

اتنے میں محلہ کی مسجد میں جمعہ کی اذان ہو گئی اور حمید نماز کے لئے چلا گیا۔ یہ عجب اتفاق تھا کہ اس دن مولوی صاحب نے خطبے سے پہلے وعظ میں ماں باپ کی اطاعت کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ انھوں نے بتایا کہ شریعت کی رو سے ماں باپ کی اطاعت عین فرض ہے۔ ماں باپ کا درجہ، خدا کے درجے کے برابر ہوتا ہے۔ جو شخص ان کا حکم نہیں مانتا اسے خدا کبھی نہیں بخشتا۔ وہ سیدھا دوزخ میں جاتا ہے۔ پھر انھوں نے بتایا کہ انگریزی تعلیم نے آجکل کے نوجوانوں کو کس قدر خود سر بنا دیا ہے کہ نہ ان کی آنکھوں میں بزرگوں کا کوئی لحاظ، نہ ماں باپ کی اطاعت!

حمید یہ کچھ سن رہا تھا اور اس کا دل عجیب و غریب کشمکش کی آماجگاہ بن رہا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ وہ شادی نہ کرائے۔ علم، عقل، تجربہ، واقعات سب اس فیصلے کی تائید میں جاتے ہیں۔ اس بے وقت شادی کے نقصانات ایک ایک کر کے اس کے سامنے آتے تھے جنھیں وہ دو اور دو چار کی طرح صحیح پاتا تھا۔ لیکن دوسری طرف اس سے کہا جا رہا تھا کہ اس کے خدا کا حکم ہے کہ ماں

باپ کی اطاعت کرو۔ ان کے فیصلے کے سامنے اُف تک نہ کرو۔ ان سے بے چون و چرا مان لو۔ ایسا نہ کرو گے تو خدا کے مجرم ہو جاؤ گے! چونکہ بچپن کی تعلیم و تربیت سے اس کے دل پر مذہب کی بڑی گرفت تھی اس لئے اس کشمکش میں "خدا کا حکم" واقعات کے تقاضوں پر غالب آگیا۔ اس نے نماز کے بعد اپنی حماقت پر خدا سے معافی مانگی۔ مسجد سے سیدھا گھر گیا اور باپ سے باادب عرض کیا کہ مجھے معاف کر دیجئے۔ میں آپ کی آزردگیٔ خاطر کا موجب بن گیا۔ مجھے آپ کے حکم کی اطاعت میں ذرا بھی تامل نہیں۔ آپ جو کچھ چاہتے ہیں کیجئے۔ میں آپ کا فرمانبردار بیٹا ہوں اور فرمانبردار بیٹا رہوں گا۔

باپ کی آنکھیں فرطِ مسرت سے جگمگا اٹھیں۔ اس نے اٹھ کر بیٹے کو گلے سے لگا لیا۔ بہت بہت دعائیں دیں۔ ماں نے "صدقے واری" کیا اور یوں معاملہ کا فیصلہ ہو گیا۔

ذرا سوچو طاہرہ! کہ کیا خدا کا حکم اس قسم کا بھی ہو سکتا ہے کہ تم عقل و ہوش کو بھی ایک طرف رکھ دو۔ سمجھ سوچ سے بھی کام نہ لو۔ نفع نقصان کی کسی قسم کی پرواہ نہ کرو۔ اور جو کچھ تمہارے بوڑھے ماں باپ حکم دیں آنکھیں بند کئے اس کی اطاعت کئے جاؤ؟

تم کہو گی کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، یہ درست معلوم ہوتا ہے لیکن پھر اس کا کیا جواب ہے کہ خدا کا حکم ہے کہ ماں باپ کی اطاعت کرو! لیکن تمہیں تعجب ہو گا جب میں یہ کہوں گا کہ یہ خدا کا حکم ہے ہی نہیں کہ ماں باپ کی **اطاعت** کرو۔ اس کا حکم صرف یہ ہے کہ ماں باپ سے **نیک سلوک** کرو کیونکہ وہ ضعیف ہو چکے ہیں اور ہمدردی کے مستحق ہیں۔

تم کہو گی کہ یہ بات تو ایک مسلمہ کے طور پر مانی جاتی ہے کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔ یعنی یہ ایسی بات ہے جس میں کسی کو کبھی اختلاف نہیں ہوا۔

اور میں کہوں گا کہ کتنی ہی غلط باتیں ہیں جو زمانے کے گذرنے سے مسلمہ بن جاتی ہیں۔ اگر میں ان باتوں کی لسٹ مرتب کر کے تمہارے سامنے رکھوں جو ہمارے مروجہ مذہب میں بطور مسلمات مانی جاتی ہیں لیکن جو درحقیقت غلط ہیں، تو تم سر پکڑ کر بیٹھ جاؤ۔ ذرا سوچو کہ مسلمہ بنتا کس طرح ہے؟ کوئی بات جو دو تین نسلوں تک متوارث چلی آئے، بعد میں مسلمہ بن جاتی ہے۔ اسلئے کسی بات کے صحیح ہونے کی یہ دلیل نہیں کہ وہ بطور مسلمہ مانی جاتی ہے۔ صحیح اور غلط کے پرکھنے کا ایک ہی معیار ہے۔ یعنی یہ کہ اس کے متعلق قرآن کا کیا فیصلہ ہے! جسے قرآن صحیح قرار دے وہ صحیح ہے خواہ اسے ایک آدمی بھی صحیح نہ مانتا ہو۔ اور جسے وہ غلط قرار دے وہ غلط ہے خواہ اسے ساری دنیا مسلمہ کی حیثیت سے مانتی ہو۔

تم یہ بھی کہو گی کہ "ماں باپ کی اطاعت فرض ہے" ایک ایسی "حقیقت" ہے جسے صرف مسلمانوں کے ہاں ہی بطور مسلمہ نہیں مانا جاتا بلکہ دنیا کا ہر مذہب اور ہر ضابطۂ اخلاق اسے بطور مسلمہ مانتا چلا آرہا ہے۔

اور میں کہوں گا کہ قرآن کے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ ساری دنیا کیا مانتی ہے۔ وہ صرف اسی بات کو صحیح قرار دیتا ہے جو فی الحقیقت صحیح ہو۔ اگر قرآن کسی انسان کی تصنیف ہوتا تو وہ ان تمام باتوں کو علیٰ حالہ اپنے اندر شامل کر لیتا جنہیں دنیا بطور مسلمات مانتی چلی آرہی ہے۔ لیکن وہ دنیا کے پیچھے چلنے کے لئے نہیں آیا تھا۔ دنیا کو اپنے پیچھے چلانے کے لئے آیا تھا۔ اسلئے اسے اس کی پرواہ نہیں کہ ایسے تصورات اور عقائد جنہیں دنیا کے مذاہب نے اس لئے مسلمات کی حیثیت سے تسلیم کر رکھا ہے کہ ان کے

ہاں خدا کے احکام اپنی اصلی شکل میں باقی نہ رہے تو وہ باقی رہتے ہیں یا ختم ہوتے ہیں اس کا کام حقائق کو پیش کرنا تھا سو اس نے پیش کر دیئے۔

اسی ایک سوال (ماں باپ کی اطاعت کے سوال) ہی کو لو۔ یہ ٹھیک ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب اسے بطور مسلمہ کے مانتے ہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ حقیقت ہے کہ من نعمرہ ننکسہ فی الخلق (۳۶/۶۸) بڑھاپے کی عمر میں پہنچ کر انسان کی عقل اوندھی ہو جاتی ہے۔ یہ انسانی عمر کا ارذل (نکما) حصہ ہوتا ہے۔ جس میں حالت یہ ہو جاتی ہے کہ انسان سمجھ بوجھ کا درجہ پا کر پھر ناسمجھی کی حالت میں پہنچ جاتا ہے۔ (من یرد الیٰ ارذل العمر لکیلا یعلم من بعد علم شیئاً (۲۲/۵) یہ وہ حقائق ہیں جن سے نہ دنیا کا کوئی مذہب انکار کر سکتا ہے نہ ضابطۂ اخلاق۔ لیکن اس کے باوجود وہ سب یہ کہتے ہیں کہ وہ نوجوان جسے خدا نے علم و عقل عطا کیا ہے جسے قوتِ فیصلہ دی ہے۔ جس کے قویٰ میں مضبوطی اور اعصاب میں طاقت ہے۔ جس کا دماغ تازہ اور دل تنومند ہے۔ وہ اپنے معاملات میں ان لوگوں کے فیصلوں کا پابند ہو جن کی عقل فرسودہ ہو چکی ہے اور علم بیکار۔ جن کے قویٰ افسردہ ہو چکے ہیں اور اعصاب مضمحل۔ جن کے دماغ کہنہ اور بوسیدہ ہو چکے ہیں اور دل کمزور۔ جن پر عقل و فہم کے بجائے جذبات کا اثر غالب ہے۔ جو اُس زمانے کے تقاضوں ہی کو نہیں سمجھ سکتے جس میں یہ نوجوان ابھر رہا ہے۔ جو دنیا کی دوڑ میں پچاس سال پیچھے چل رہے ہیں۔ اس قسم کا حکم وہ اخلاقی ضابطے تو دے سکتے ہیں جنھیں بڑے بوڑھوں نے بنایا ہو اور وہ نوجوانوں اپنی اطاعت کرانا چاہتے ہوں۔ لیکن قرآن (جو خدا کے دین کا ضابطہ ہے) کبھی اس قسم کا حکم نہیں دے گا۔ ان اخلاقی ضوابط (یا انسانی مذاہب) کا ہیرو، مہاراجہ رام چندر ہو سکتا ہے جو باپ کے اس حکم کی اطاعت کو بھی اپنا فرض سمجھتا ہے جسے خود باپ بھی غلط سمجھتا ہے اور محض اپنی مجبوری کی بنا پر اسے نافذ کرتا ہے۔ لیکن قرآن کا ہیرو، ابراہیم ہے جو باپ سے علانیہ کہہ دیتا ہے کہ تم جس روش پر چل رہے ہو وہ روش غلط ہے۔ اسلئے میں اس روش پر نہیں چلوں گا۔ اور قرآن (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کے اس فیصلہ کو آنے والوں کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ قرآن سرکشی سکھاتا ہے۔ وہ اطاعت سکھاتا ہے لیکن اطاعت کس کی؟ خدا کے حکم کی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں ایک طرف (حضرت) ابراہیم کو اسلام کا ہیرو قرار دیتا ہے وہاں (حضرت) اسمٰعیلؑ کو بھی ایسا ہی ہیرو قرار دیتا ہے جس نے باپ کی چھری کے نیچے اپنی گردن رکھ دی۔ لیکن کیوں رکھ دی؟ باپ کے حکم کی تعمیل کے لئے نہیں بلکہ اس لئے کہ اس نے اس حکم کو خدا کا حکم سمجھا تھا۔ اسی لئے اس نے کہا تھا کہ یا ابت افعل ما تؤمر (۳۷/۱۰۲) "اے باپ! جو کچھ تجھے حکم ملا ہے تو اس کی تعمیل کر" (یہ الگ بات ہے کہ وہ حکم خدا کا تھا ہی نہیں۔ اسے ایسا سمجھ لیا گیا تھا) لہٰذا قرآن کی رُو سے اطاعت خدا کے احکام کی ہے۔ ماں باپ (یا کسی اور کے) حکم کی نہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ جب تک بچہ سنِ بلوغ کو نہ پہنچے، اس کے معاملات کے فیصلے اور ان کی نگہداشت اس کے ماں باپ یا ولی (GUARDIAN) کے ذمے ہے۔ اس لئے اسے اپنے معاملات کے فیصلے خود نہیں کرنے چاہئیں۔ اس کے بعد (بجز اس صورت کے کہ وہ فاتر العقل ہو) اسے خدا کے احکام کی روشنی میں اپنے معاملات کے فیصلے خود کرنے چاہئیں۔ لہٰذا، ایک صحیح العقل نوجوان کے لئے ماں باپ کی اطاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ان سے مشورہ لے سکتا ہے، ان کے فیصلوں کا پابند نہیں ہو سکتا۔ یہ تو غنیمت ہے کہ نوعِ انسانی نے اس اخلاقی ضابطہ (ماں باپ کی اطاعت فرض ہے) پر بہیئتِ مجموعی عمل نہیں کیا (اور نہ ہی یہ ممکن العمل تھا ہی) ورنہ اگر انسانیت اس پر مجموعی طور پر عمل پیرا ہو جاتی تو دنیا آج وہیں ہوتی جہاں وہ پہلے دن تھی۔ اس میں ذرا سی بھی علمی اور عملی ترقی نہ ہوتی۔ اسلئے کہ جب ہر آنے والی نسل جانے والی نسل ہی کے فیصلوں کی پابند رہتی تو

آنے والی نسل کا قدم آگے کیسے بڑھتا؟ جانے والی نسل کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے گذرے ہوئے دَور کو انسانیت کا بہترین زمانہ قرار دیتی ہے اور جو اس سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہٹتا ہے اس کے خلاف دانت پیستی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بوڑھا آدمی اپنے زمانے کو یاد کر کر کے روتا ہے اور آنے والے زمانے کو کوستا ہے کہ اسے ہر اچھائی اپنے زمانے میں نظر آتی ہے اور ہر برائی آنے والے زمانے میں۔ حالانکہ کائنات اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اوپر کو اُٹھ رہی ہے۔ نیچے نہیں جا رہی۔ آگے بڑھ رہی ہے پیچھے نہیں ہٹ رہی۔

بہرحال یہ ہے عزیزہ! قرآن کا فیصلہ اس باب میں جسے تم بھی اب تک ایک مسئلہ سمجھ رہی تھیں!

اب آئی بات تمہاری سمجھ میں کہ اس مسجد کے خطیب نے حمید بچارے کو کس پٹڑی پر ڈال دیا تھا!

بہرحال اس طرح رشیدہ کی شادی حمید کے ساتھ ہوئی۔ شروع کے ایک دو مہینے تو چاؤ چونچلوں میں گذر گئے لیکن اس کے بعد اس غلط اقدام کی تلخیاں سامنے آنی شروع ہو گئیں۔

انسانی معاشرہ میں "ساس" کا مسئلہ ایسا پیچیدہ اور دقیق ہے کہ ابھی تک کوئی دماغ اس کا حل سوچ نہیں سکا۔ مشرق ہو یا مغرب، ساس کا سوال ہر جگہ موجود ہے۔ مشرق میں چونکہ (بالعموم) بیوی شریکِ مغلوب اور کمزور ہوتی ہے اس لئے یہاں ساس، اپنی بہو کے لئے وبالِ جان بنتی ہے۔ لیکن مغرب میں چونکہ مرد بچارا مغلوب ہوتا ہے اس لئے وہاں کی ساس اپنے داماد کے لئے ہوا بنی رہتی ہے۔ (اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ساس خود اپنی ماں سے بھی زیادہ شفیق اور ہمدرد مل جاتی ہے لیکن یہ مستثنیات میں سے ہے۔ قاعدہ کلیہ وہی ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے) جہانتک میں نے غور کیا ہے، ساس کا مسئلہ معاشرتی یا معاشی سے کہیں زیادہ نفسیاتی (PSYCHOLOGICAL) ہے۔ ماں نے جس انداز سے اپنے بیٹے کو پرورش کیا ہوتا ہے اس کی بنا پر وہ اسے اپنی "واحد ملکیت" سمجھتی ہے۔ وہ اس کے جملہ حقوق اپنے حق میں محفوظ خیال کرتی ہے۔ وہ اس کی محبت اور توجہ میں کسی اور کو شریک دیکھنا نہیں چاہتی۔ ماں کے دل میں یہ تمام جذبات غیر شعوری طور پر موجزن رہتے ہیں تاآنکہ بیٹا جوان ہو جاتا ہے اور وہ اس کی شادی کی فکر کرنے لگتی ہے۔ اِس وقت اس کے دل میں قطعاً یہ خیال نہیں گذرتا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے ایک ایسی چیز کو گھر میں لا رہی ہے جو اس کے بیٹے کے لئے اس سے کہیں زیادہ وجہِ جاذبیت بن جائے گی۔ وہ یہ سمجھ رہی ہوتی ہے کہ میں اپنے بیٹے کے لئے بیوی لا رہی ہوں اور چونکہ بیٹا میری واحد ملکیت ہے اس لئے جو کچھ بیٹے کا ہوگا وہ میری ہی ملکیت ہوگا۔ وہ اگر اس آنے والی کو کچھ حیثیت دیتی ہے تو فقط اتنی کہ وہ اس کے لئے پوتے اور پوتیاں مہیا کرنے کا ذریعہ بنے گی۔ وہ یہ سب کچھ اس جذب و انہماک سے کرتی ہے کہ اس کا خیال کبھی اس طرف آتے ہی نہیں پاتا کہ میں اپنے ہاتھوں سے اپنا "شریک" پیدا کر رہی ہوں۔ لیکن بہو کو گھر میں لانے کے بعد، اس پر یک لخت یہ راز کھلتا ہے کہ اس کا بیٹا اس کے ہاتھوں سے نکل گیا! اور چونکہ اس کی وجہ وہی بہو ہوتی ہے اس لئے وہ اسے اپنی متاعِ بردہ کا رہزن سمجھتی ہے اور اپنی شکست کا پورا پورا انتقام اس سے لینے پر تل جاتی ہے۔ اس کی اس نفسیاتی کیفیت کا اندازہ نہ تو اس کا بیٹا کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کی بہو (اس لئے کہ ان کا خیال بھی اس طرف نہیں آسکتا کہ انھوں نے اس کا کچھ چھین لیا ہے) اس لئے وہ اس کی ناراضگی کی وجوہات اور گوشوں میں تلاش کرتے رہتے ہیں اور معاملہ دن بدن بگڑتا چلا جاتا ہے۔ [چونکہ باپ اپنے بیٹوں کے متعلق اس قسم کا تصور ذہن

میں نہیں رکھتا جس قسم کا تصور ماں رکھتی ہے اس لئے وہ اپنی بہو کی آمد پر اس قسم کی نفسیاتی الجھن میں کبھی گرفتار نہیں ہوتا۔ اس کی شکایات اگر کبھی ہوتی ہیں تو وہ اور نوعیت کی ہوتی ہیں۔

بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ چونکہ ہر گھر میں بہو کے ساتھ ساس اسی قسم کا سلوک کرتی ہے اس لئے جب یہی بہو کچھ عرصہ کے بعد خود ساس بنتی ہے تو وہ اپنی ساس کے مظالم کا انتقام اپنی بہو سے لیتی ہے اور یہ سلسلہ مسلسل آگے بڑھتا رہتا ہے۔

بہرحال اس کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرہ کے ۹۹ فیصدی گھروں میں جس جہنم کا عذاب دکھائی دیتا ہے اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ شادی سے پہلے لڑکے کی ماں، لڑکے کی اس نئی زندگی کے لئے اپنے آپ کو بالکل تیار نہیں کرتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اس عذاب میں جلتی ہے اور اس نئے جوڑے کی زندگی کو بھی عذاب بنا دیتی ہے اور کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ یہ کچھ کیوں ہو رہا ہے اور اس کا علاج کیا ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا طاہرہ! کہ ایسے گھروں میں جس قدر جھگڑے اٹھتے ہیں جب ان کا تجزیہ کیا جائے تو بات کچھ بھی نہیں نکلتی۔ بات درحقیقت کچھ ہوتی بھی نہیں۔ اصل بات تو وہی ہوتی ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے لیکن اس کا شعوری طور پر علم نہ ماں کو ہوتا ہے نہ بیٹے کو اور نہ ہی اس بچاری نو وارد کو۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں ان جھگڑوں کو لاعلاج تصور کر لیا گیا ہے اور یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔ لیکن طاہرہ بیٹی! یہ سب جہالت کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ شادی کی تجویز کرنے سے پہلے ..... ماں کو اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہئے کہ اب اس کے بیٹے نے اپنی نئی زندگی شروع کرنی ہے جس میں اس کی محبت اور جاذبیت بیوی کی طرف منتقل ہو جانی ہے اور ماں سے صرف حسنِ سلوک کا تعلق باقی رہنا ہے۔ اگر وہ اسے سمجھ لیتی ہے تو پھر اس کے بعد اس کی عمل شکل یہ ہے کہ شادی کے ساتھ ہی بیٹے کو اپنی زندگی بسر کرنے کیلئے الگ کر دیا جائے۔ وہ اپنے گھر میں اپنی ذمہ داری کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرے اور ان کے معاملات میں قطعاً دخل نہ دیا جائے۔ اس طرح تم دیکھو گی کہ وہ بیٹا بھی ماں کا خدمت گذار رہے گا اور بہو بھی ساس کی تعظیم کرے گی۔ اور اگر اس خاندان کی معاشی حالت ایسی ہو کہ دو گھروں کے الگ الگ اخراجات کی صورت ممکن نہ ہو تو پھر لڑکے کی شادی اس وقت تک کبھی نہیں کرنی چاہئے جب تک اس کے الگ گذارے کی صورت پیدا نہ ہو جائے۔ اس کے سوا اس جہنم سے بچنے کی کوئی صورت نہیں جس کے شعلے اس وقت ہمارے گھروں کو اس طرح خاکستر بنائے جا رہے ہیں۔

حمید کے معاملے میں ماں کی اس نفسیاتی کشمکش کے علاوہ معاشی مشکل بھی تھی جس سے وہ بچا رہا پہلے ہی خائف تھا۔ شادی کے اخراجات کا قرض۔ گھر کا بڑھتا ہوا خرچ۔ باپ کی مسلسل بیماری۔ جب ان تمام باتوں کا مجموعی اثر مرتب ہوا تو ساس کا نزلہ غریب رشیدہ پر گرنا شروع ہو گیا۔ وہی رشیدہ جس کے متعلق ابھی چند دن (شادی سے پہلے) یہ کہا جاتا تھا کہ وہ بیحد سمجھدار، سلیقہ شعار، کم سخن، نیک، اطاعت شعار ہے، اب اس میں کیڑے پڑنے شروع ہو گئے۔ منحوس۔ سبز قدم۔ جس دن سے ہمارے گھر میں آئی ہے گھر کی برکت اٹھ گئی ہے۔ اسی آمدنی میں یہ گھر بھرا ہوا نظر آیا کرتا تھا۔ اب ایسی تابرکتی ہوئی ہے کہ گھر بھائیں بھائیں کرتا ہے۔ نہ کوئی سلیقہ۔ نہ تمیز۔ نہ کھانے پکانے کا ڈھنگ، نہ رکھنے سنبھالنے کا خیال۔ معلوم نہیں، اس کی ماں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ بیٹی کو ساری عمر اپنے گھٹنے سے باندھے رکھنا ہے اور کسی پرائے گھر میں بھیجنا ہی نہیں جو اسے ایسی لاڈلی بنا رکھا تھا۔ یہ اور اسی قسم کی اور ہزار باتیں۔ ادھر صبح حمید گھر سے نکلا اور اُدھر یہ کلکل شروع ہوئی

اور شام تک طعن و تشنیع کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ رشیدہ نے ہزار جتن کئے کہ کسی طرح اس کی ساس اس سے راضی رہے لیکن جہاں قصور یہ ہو کہ "آٹا گوندھتی کا سر کیوں ہلتا ہے" وہاں خوش رکھنے کی تدبیر کیا کل سکتی ہے؟ رشیدہ یہ سب کچھ اپنے جی پر سہتی تھی اور کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہ ہونے دیتی تھی۔ حتیٰ کہ اس نے حمید سے بھی اس کا کبھی ذکر نہ کیا۔ جب اس کی ساس نے دیکھا کہ حمید اپنی بیوی کو کچھ نہیں کہتا تو اس نے خود حمید سے بھی رشیدہ کی شکایات شروع کر دیں اور اس طرح جہنم کی آگ کے وہ شعلے جنہیں اس وقت رشیدہ اپنے دامن میں سمیٹتی چلی آ رہی تھی حمید کے گریبان تک بھی جا پہنچے۔ وہ مالی مشکلات کی وجہ سے پہلے ہی پریشان تھا اب اس کے سر پر یہ نئی قیامت ٹوٹی۔ اس کی مصیبت کی نوعیت بھی عجیب و غریب تھی۔ وہ سمجھدار لڑکا تھا اس لئے وہ بات کو جانچ کر اس نتیجہ تک پہنچ جاتا تھا کہ رشیدہ بالکل بے قصور ہے اور اس کی ماں کی سراسر زیادتی ہے، لیکن ماں باپ کی عظمت و عقیدت کا جو تصور بچپن سے اس کے دل میں جاگزیں تھا اور ان کی اطاعت کے جو وعظ اس نے سن رکھے تھے ان کے پیش نظر وہ اس کی جرأت ہی نہیں کر سکتا تھا کہ بیوی کے مقابلے میں ماں کو قصوروار ٹھہرا دے۔ لیکن اس سے اس کا دل جس نفسیاتی کشمکش کی آماجگاہ بن گیا اسے تو وہ نہیں روک سکتا تھا۔ بیوی کی مظلومیت۔ ماں باپ کی اطاعت۔ اپنی بے بسی۔ یہ وہ احساسات تھے جو اسے سانپ بن کر ڈستے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس مصیبت کا حل یہی ہے کہ وہ ماں باپ سے علیحدہ ہو جائے لیکن معاشی مجبوریاں اس حل کو ناممکن بنا رہی تھیں۔ ایک آدھ مرتبہ اس نے اس خیال کا اظہار بھی کیا تو ماں نے سر پیٹ کر کہا کہ تو مجھ سے الگ ہو گیا تو میں کنوئیں میں گر کر مر جاؤں گی! ان پریشانیوں نے حمید کو بھی اندر ہی اندر کھوکھلا کر دینا شروع کر دیا۔ لیکن حمید سے کہیں زیادہ اس کا اثر رشیدہ پر تھا۔ جو کچھ خود اس کے ساتھ ہوتا تھا اسے تو وہ شاید جھیلتی چلی جاتی لیکن حمید کی خاموش پریشانیاں، جن کے لئے ناقابلِ برداشت تھیں۔ اس سے اسے بری طرح گھن لگ گیا اور وہ اندر ہی اندر سوکھتی چلی گئی۔ اسی حالت میں اس کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا۔ ظاہر ہے کہ جس بچے کی ماں کی صحت کا یہ عالم ہو وہ بچہ پیدا ہوتے ہی اپنے اندر کیا کیا بیماریاں (یا ان کے پیدا ہونے کے اسباب) نہیں لائے گا؟ ایک تو رشیدہ کی صحت خراب اس پر غریبی۔ نہ اس کی ہی دیکھ بھال ہو سکی اور نہ بچے کی۔ ہو سکتا تھا کہ حمید کی ماں اپنے بیٹے کے سب سے پہلے بچے کی نگہ پرداخت کے لئے کہیں نہ کہیں سے قرض لیکر بھی کچھ کرتی لیکن بدقسمتی سے وہ تھی لڑکی۔ جس کی پیدائش کی خبر سن کر وہ جل بھن کر کوئلہ ہو گئی تھی "منحوس ہو کی منحوس لڑکی"۔ بھلا اس کی دیکھ بھال کون کرتا؟ تین مہینے تک وہ بچاری کسی نہ کسی طرح زندہ رہی۔ پھر اپنی غمزدہ ماں کے کلیجے پر مستقل ناسور چھوڑ کر چل بسی۔ اس کے بعد رشیدہ کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ اسے تپ لازم ہو گیا۔ تقسیم کی افتاد سے اس کے ماں باپ بھی بہت غریب ہو چکے تھے۔ دوا دارو کہاں سے آتی۔ بس اس طرح اس نے گھل گھل کر جان دیدی!

یہ ہے طاہرہ! تمہاری بچپن کی سہیلی کی الم انگیز داستان! یہ اس کی داستان نہیں، داستان ہے تمہارے پورے معاشرے کی۔ کیا معلوم کتنی رشیدہ ہر روز اس کی بھینٹ چڑھتی ہیں۔ اول تو کسی کو علم نہیں ہونے پاتا کہ کس گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ اور اگر علم ہونے پاتا ہے تو صرف اتنا کہ آج فلاں کی بیٹی یا فلاں کی بہو کا انتقال ہو گیا۔ اس سے زیادہ کسی کو کیا خبر کہ مرنے والی کس طرح مری ہے۔

ایک جلنے کے سوا اور کوئی کیا جانے حالتیں کتنی گذر جاتی ہیں پروانے پر

معلوم نہیں طاہرہ! جب خالد میاں جوان ہوں گے اور تم ان کی شادی کی فکر کر رہی ہوگی تو اس وقت میں موجود ہوں گا یا نہیں۔ لیکن میری دو تین باتیں ضرور یاد رکھنا۔ اگر تم نے ان پر عمل کیا تو تمہاری زندگی بھی سکھ سے گذریگی اور خالد میاں اور اس کی بیوی کی زندگی بھی مسرتوں کے جھولے جھولیگی۔ سب سے پہلے تو یہ کہ خالد کی شادی کی فکر اس وقت کرنا جب وہ اتنا کمانے کے قابل ہو جائے کہ اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ خود اٹھالے اور اگر خدانکردہ حالات ایسے ہو جائیں کہ اسے ماں باپ کی بھی مالی امداد کرنی پڑے تو وہ یہ بھی نہایت آسانی سے کر سکے۔

پھر اس کی شادی سے پہلے یہ اچھی طرح سمجھ لینا کہ اس کی توجہات کا بیشتر حصہ اس کی رفیقۂ زندگی کے لئے مختص ہو جائے گا اور تمہارا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ نہیں اس سے صرف حسنِ سلوک کی توقع رکھنی ہوگی۔

شادی کے ساتھ ہی اس کے آزادانہ طور پر الگ رہنے کا بندوبست کر دینا اور ان کے گھر کے معاملات میں کم از کم دخل دینا۔ جسقدر دخل دینا ضروری سمجھو اسے بھی محض مشورۃً کہنا اور اگر وہ اس مشورہ کو قبول نہ کریں تو اس کا قطعاً احساس نہ کرنا۔

اس کے بعد تم دیکھو گی کہ خالد کس طرح تمہاری عزت کرتا ہے اور تمہاری بہو کس طرح تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیتی ہے۔

لکھنے کو تو میں تمہیں یہ سب کچھ لکھ رہا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی جی ہی جی میں ہنس بھی رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آج یہ تمام باتیں تمہیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ تم ایک ایک لفظ کی تائید کرتی ہو اور کہتی ہو کہ واقعی ہونا ایسا ہی چاہئے۔ لیکن اُس وقت تمہیں ان میں سے شاید ایک بات بھی یاد نہ رہے۔ اس لئے کہ آج تم بہو ہو اور کوئی اور تمہاری ساس ہے۔ اور اُس وقت تم ساس ہوگی اور کوئی اور تمہاری بہو ہوگی!

دنیا کا چکر بھی عجیب ہے۔ لیکن یہ چکر ہمارا اپنا پیدا کردہ ہے۔ دنیا کے بنانے والے کا پیدا کردہ نہیں ہے۔ وہ سب کو ایک جیسا انسان پیدا کرتا ہے اور ہم ان انسانوں کو ساس اور بہو بنا دیتے ہیں۔ اس کے بعد ساس اور بہو تو باقی رہ جاتی ہیں اور انسان ختم ہو جاتا ہے۔

لیکن خدا کا قانون انسان کو ہر حال میں باقی رکھتا ہے۔ اسے کبھی ختم نہیں ہونے دیتا۔ بلکہ اسے ہر لمحہ بلند سے بلند تر کرتا جاتا ہے۔ لہٰذا تم بہو بنو یا ساس۔ اپنے اور دوسرے کے انسان ہونے کو کبھی نہ بھولنا۔ خدا نے ہر فرزندِ آدم کو واجب التکریم پیدا کیا ہے (ولقد کرمنا بنی آدم) جو شخص ہر حال میں اس حقیقت کو سامنے رکھتا ہے۔ اسے مسلمان کہتے ہیں۔

اچھا خدا حافظ۔ خالد میاں سے دعا کہنا۔

پرویز

۸ جنوری ۱۹۵۲ء

اسلامی نظام

دورِ حاضرہ کی ایک بلند پایہ کتاب۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت کے نظام اور آئین کے بنیادی اصول کیا ہیں؟ وہ نظام آج کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔ اس میں محترم پرویز صاحب اور علامہ محمد اسلم جیراج پوری کے وہ مقالات شامل ہیں جنہوں نے قوم کے سنجیدہ طبقہ کے سامنے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔

ضخامت ۲۰۸ صفحات مجلد مع گردپوش۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصولڈاک)

زمانۂ عدت میں نکاح

پرویز

میں نے "سلیم کے نام" چھٹے خط میں (جواب مجموعۂ خطوط میں چھپ چکا ہے) طلاق کے ضمن میں یہ لکھا تھا[1] کہ اگر عدت کے دوران میں سابقہ میاں بیوی چاہیں تو تجدیدِ نکاح کے بعد پھر سے میاں بیوی کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ یعنی عدت کے دوران میں مطلقہ عورت کسی اور مرد سے نکاح نہیں کر سکتی لیکن اپنے سابقہ شوہر سے نکاح کر سکتی ہے۔ علامہ اسلم جیراجپوری (مدظلہ العالی) نے مجھے لکھا ہے کہ عدت کے دوران میں، اگر سابقہ شوہر چاہے تو بلا تجدیدِ نکاح اپنی بیوی کو بیوی کی حیثیت سے رکھ سکتا ہے۔ البتہ جب عدت کی مدت ختم ہو جائے تو پھر ان میں مفارقت ہو جائے گی اور اس کے بعد اگر یہ پھر میاں بیوی کی حیثیت سے رہنا چاہیں تو انھیں تجدیدِ نکاح کی ضرورت ہوگی۔ یعنی میرے فہم کے مطابق سابقہ میاں بیوی کو عدت کے دوران میں بھی اور بعد عدت بھی تجدیدِ نکاح کی ضرورت ہے۔ اور علامہ موصوف کے ارشاد کے مطابق عدت کے دوران میں تجدیدِ نکاح کی ضرورت نہیں۔

میں جن دلائل سے مذکورہ بالا نتیجہ تک پہنچا تھا وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) قرآن نے طلاق تک پہنچنے کے لئے جن طویل اور دقیق مراحل کو تجویز کیا ہے وہ خود اس کی شہادت دیتے ہیں کہ طلاق کا اعلان اسی وقت ہوگا جب زوجیت کے تعلق کے باقی رہنے کی کوئی صورت نہ رہے۔ لہٰذا طلاق کا اعلان، تعلقاتِ زوجیت کے انقطاع کا اعلان ہے۔ خود طلاق کا لفظ بھی اس پر شاہد ہے جس کے معنی آزاد ہو جانے کے ہیں۔ یعنی جب طلاق کا اعلان ہو گیا تو میاں بیوی، نکاح کی قید سے آزاد ہو گئے۔

(۲) طلاق کے بعد (عدت کے دوران میں) اگر مرد اپنی مطلقہ بیوی کو روکنا چاہے تو اس کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ

واذا طلقتم النساء فبلغن اجلھن فامسکوھن بمعروف او سرحوھن بمعروف ... (۲/۲۳۱)

اور جب تم عورتوں کو طلاق دیدو اور وہ اپنی میعاد کو پہنچ جائیں تو تم انھیں یا تو قاعدے کے مطابق (بمعروف) روک لو، یا قاعدے کے مطابق رخصت کر دو۔

قرآن نے مطلقہ بیوی کو عدت کے دوران میں (یعنی عدت کے آخری دن تک) روکنے (امساک) کے لئے "معروف" کی شرط عائد کی ہے۔ اور کسی عورت کو روکنے کا معروف طریقہ نکاح ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس کی تصریح قرآن نے اس سے اگلی آیت میں خود ہی کر دی ہے جہاں عورت کے اہل خاندان سے کہا ہے کہ

---

[1] اسی کو میں نے "طاہرہ کے نام" ایک خط میں بھی دہرایا ہے۔ اور ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع شدہ کتاب "قرآنی فیصلے" میں بھی اس کا اعادہ ہوا ہے۔

واذا طلقتم النساء فبلغن اجلھن فلا تعضلوھن ان ینکحن ازواجھن اذا تراضوا بینھم بالمعروف ... (۲/۲۳۲)

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی میعاد کو پہنچ جائیں تو انھیں اس بات سے مت روکو کہ وہ اپنے (سابقہ) خاوندوں سے نکاح کرلیں جب وہ اس پر طریقہ کے مطابق رضامند ہوں۔

ان دونوں آیتوں میں "فبلغن اجلھن" کے الفاظ ہیں لہٰذا ان میں جو حکم دیا گیا ہے وہ ایک ہی زمانے سے متعلق ہے یعنی عدت کے زمانے سے۔ پہلی آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر اس زمانے میں مرد چاہے تو عورت کو "بمعروف" روک سکتا ہے۔ اور دوسری آیت میں کہا گیا ہے کہ اس زمانے میں اگر وہ میاں بیوی باہمی رضامندی سے نکاح کرنا چاہیں تو انھیں ایسا کرنے سے مت روکو۔ لہٰذا آیت (۲/۲۳۲) میں "فامسکوھن بمعروف" کے معنی (آیت ۲/۲۳۲ کی روشنی میں) "باہمی رضامندی سے نکاح" کے ہوں گے۔

(۳) سورۂ طلاق میں حکم دیا گیا ہے کہ مطلقہ عورتوں کو عدت کے دوران میں گھروں سے نہ نکال دیا کرو اور ان کے نان نفقہ کا بھی انتظام رکھو۔ اگر مطلقہ عورت، عدت کے دوران میں بدستور بیوی کی حیثیت لئے رہتی تو وہ بیوی کی حیثیت سے ان تمام چیزوں کی مستحق تھی۔ اس کیلئے الگ احکام کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ طلاق سے رشتہ مناکحت منقطع ہوگیا۔ اور جن کا رشتہ مناکحت منقطع ہوجائے وہ دوبارہ میاں بیوی نکاح ہی کے رو سے بن سکتے ہیں۔

یہ تھے مختصراً وہ دلائل جن کی بنا پر میں نے سمجھا تھا کہ عدت کے دوران میں پھر سے میاں بیوی بننے کیلئے تجدید نکاح کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس کے برعکس علامہ موصوف نے فرمایا ہے کہ

(۱) قرآن نے کہا ہے کہ اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن واحصوا العدۃ (۶۵/۱) "جب تم عورتوں کو طلاق دو تو یہ طلاق عدت کے لئے دو اور عدت کا شمار کرو" یعنی طلاق ہوتی ہے عدت اور عدت شماری کے لئے۔ ان کی مفارقت عدت کے بعد ہوتی ہے جس کے متعلق ارشاد ہے کہ

فاذا بلغن اجلھن فامسکوھن بمعروف او فارقوھن بمعروف واشھدوا ذوی عدل منکم .... (۶۵/۲)

جب مطلقہ عورتیں اپنی میعاد تک پہنچیں تو یا تو انھیں قاعدے کے مطابق روک لو اور یا قاعدے کے مطابق الگ کردو۔ اور اس پر اپنے میں سے دو صاحب عدل گواہ رکھ لو۔

لہٰذا طلاق سے بیوی زوجیت سے خارج نہیں ہوتی بلکہ ختم عدت کے بعد مفارقت ہوتی ہے۔ عدت کے دوران میں میاں کو حق امساک (رجوع لینے کا حق) حاصل ہے جس کے لئے بیوی کی رضامندی کی ضرورت نہیں۔ البتہ عدت کی مدت کے بعد تجدید نکاح کی ضرورت ہوگی۔

(۲) سورۂ بقرہ کی دونوں آیتوں میں (۲/۲۳۱ اور ۲/۲۳۲ میں جنھیں اوپر نقل کیا گیا ہے) "بلوغ اجل" کے معنی ایک ہی ہیں۔ یعنی ختم عدت لیکن پہلی آیت میں عین ختم عدت کا دن مراد ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ اس دن شوہر کو دو ٹوک فیصلہ کرنا ہے۔ اس دن اسے عورت کو اپنی زوجیت میں رکھنے کا آخری حق ہے یا اسے الگ کردینے کا۔ الگ کردینے کی صورت میں عورت آزاد ہوجاتی ہے۔ اب اگر وہ دونوں پھر ایک ساتھ رہنے پر رضامند ہوجائیں تو انھیں باقاعدہ نکاح کرنا ہوگا۔ یہی دوسری آیت کا منشا ہے جس میں عورت کے اولیاء کو نصیحت کی گئی ہے کہ وہ اس نکاح میں

روکاوٹ نہ ڈالیں۔

یہ ہے علامہ ممدوح کے ارشاد کا خلاصہ۔

اس میں شبہ نہیں کہ سورۂ طلاق کی آیت (فطلقوھن لعدتھن واحصوا العدۃ) میں یہی حکم ہے کہ طلاق، عدت کے لئے دو اور اس سے عدت شماری کرو۔ لیکن میں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ طلاق ایسے وقت میں دو جب عدت کا شمار ہو سکے۔ عدت کی مدت (عام حالات میں) تین حیض ہوتی ہے اس لئے سورۂ طلاق کی مذکورہ بالا آیت کا منشا یہ ہے کہ طلاق، حیض کے بعد حالتِ طہر میں دی جائے تاکہ عدت شماری میں کوئی دقت یا اشتباہ نہ ہو۔ لیکن علامہ صاحب نے جو یہ فرمایا ہے کہ قرآن نے "بلوغ اجل" کے بعد "رد کنے اور الگ کر دینے" کے لئے دو گواہوں کو ضروری قرار دیا ہے تو اس سے اس دلیل کا وزن بہت بڑھ جاتا ہے کہ "الگ کر دینے" کا فیصلہ عدت کے آخری دن ہی کیا جاتا ہے۔ عدت کے دوران میں امساک (روک لینے) کا اختیار باقی رہتا ہے۔

جب اسے تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہی سمجھنا ہوگا کہ سورۂ بقرہ کی آیات (۲/۲۳۱ اور ۲/۲۳۲) میں سے دوسری آیت (واذا طلقتم النساء فبلغن اجلھن فلا تعضلوھن ان ینکحن ازواجھن) "فبلغن اجلھن" کے معنی ہوں گے عدت کے بعد۔ اور پہلی آیت (واذا طلقتم النساء فبلغن اجلھن فامسکوھن بمعروف ...) میں "فبلغن اجلھن" کے معنی ہوں گے عدت کے دوران میں۔

جیسا کہ میں کئی مرتبہ لکھ چکا ہوں (اور خود علامہ اسلم صاحب نے بھی تحریر فرمایا ہے) شخصی فقہ (خواہ وہ قرآن ہی سے کیوں نہ مستنبط کی جائے) کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ فقہ وہی مستند ہوگی جسے قرآنی نظامِ ملت، باہمی مشاورت سے قرآن کے رو سے مرتب اور قانون کی حیثیت سے نافذ کریگا۔ اسلئے آج ہم قرآن سے جو فقہی مسائل سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ علمی اور نظری بحث ہوتی ہے جس کا قاعدہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ ہمارے مروجہ فقہی قوانین کس حد تک قرآن کے مطابق ہیں اور کس حد تک قرآن کے خلاف۔ جیسا کہ میں (سلیم کے نام مذکورہ بالا خط میں) لکھ چکا ہوں۔

طلاق کے متعلق ہمارا مروجہ قانون (خواہ وہ اہلِ فقہ کا ہو یا اہلِ حدیث کا) قرآن کے بالکل خلاف ہے۔

نوادرات

مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری

بڑا سائز ضخامت چار سو صفحات قیمت چار روپے محصول ڈاک نو آنے

ادارۂ طلوع اسلام۔ کوی روڈ (صدر) کراچی

آپ نے شاید اس پر غور نہیں کیا؟

آج نہ صرف پاکستان میں بلکہ تمام عالم اسلامی میں ادارۂ طلوع اسلام وہ واحد ادارہ ہے جو قرآنی فکر کو عام کرنے اور اس فکر کے مطابق معاشرہ کو متشکل کرنے کیلئے سوچ رہا اور کام کر رہا ہے۔ غیر مسلم تو ایک طرف خود مسلمانوں کی طرف سے بھی قرآنی فکر کی مخالفت ہو رہی ہے کیونکہ اندھیرے میں رہنے والوں کیلئے روشنی کا وجود بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس بنا پر ان حضرات کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں جو دل سے چاہتے ہیں کہ دنیا میں پھر سے قرآنی معاشرہ قائم ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے ہم نے ایک اسکیم پیش کی تھی کہ ایک سو روپیہ کی رقم ہمیں پیشگی دیدی جائے ہم اس کے معاوضہ میں آہستہ آہستہ طلوع اسلام کی کتابیں ان حضرات کو دیتے جائیں گے تا آنکہ ان کی سو روپیہ کی رقم پوری ہو جائے۔ اگر کسی طرح سے اس اسکیم کو بند کرنا پڑا تو ان کی بقایا رقم انھیں واپس دیدی جائے گی۔ یہ ایک خالص کاروباری اسکیم تھی جس میں ہم نے بطور عطیہ کچھ نہیں مانگا تھا لیکن ہمیں افسوس ہے کہ طلوع اسلام کے ہزارہا قارئین میں سے اس وقت تک صرف ایک سو پچاسی ۱۸۵ حضرات نے شمولیت اختیار کی ہے ان میں سے ۱۷۳ ناموں کا اعلان اس سے پہلے ہو چکا ہے بقایا بارہ ۱۲ حضرات کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

کراچی	(۱۷۴) بیگم قاضی عبدالعزیز صاحب ۔ ۶۶۶ آؤٹ رم روڈ
	(۱۷۵) مصطفےٰ احسن صاحب ۔ ۲۲۷۴ پیر الٰہی بخش کالونی
	(۱۷۶) میاں خوشی محمد صاحب ۔ ۶۵ ۔ اے بریٹو روڈ
	(۱۷۷) عبدالغفور صاحب ۔ الیف ۹۸ جیکب لائن
	(۱۷۸) مرزا رمضان بیگ صاحب ۔ پاک فاؤنڈری اینڈ انجینیرنگ ورکس ۔ لارنس روڈ
لاہور	(۱۷۹) آفتاب احمد خاں صاحب
	(۱۸۰) علی احمد خاں صاحب ۔ والٹن ٹریننگ سکول
لائلپور	(۱۸۱) میاں اللہ بخش صاحب ۔ چک ۶۷۱ پیر محل
منٹگمری	(۱۸۲) محمد اکرم رانجھا صاحب ۔ چک 7/1AL براستہ رینالہ خورد
سرگودھا	(۱۸۳) راجہ خداداد صاحب ایم ایل اے
کویت	(۱۸۴) محمد صادق صاحب ۔ سی اینڈ ایم پی ۔ احمدی
مردان	(۱۸۵) عبدالقیوم خاں صاحب

جناب پرویز کے ترجمۂ قرآن اور قرآنی لغت کے علاوہ جس کی تالیف میں وہ اس وقت شب و روز منہمک ہیں، ہمارے سامنے بہت سی کتابیں اشاعت کیلئے تیار رکھی ہیں۔ مثلاً معارف القرآن کی پہلی تینوں جلدیں (جو اب نایاب ہیں اور جنھیں مصنف کی نظر ثانی کے بعد شائع کئے جانے کا انتظام در پیش ہے) نظام ربوبیت (جو دور حاضرہ کی ایک نادر تصنیف ہے) فردوس گم گشتہ (مجموعۂ مضامین جناب پرویز) پاکستان کی چھ سالہ زندگی پر محاکمہ۔ جماعت اسلامی سے متعلق ایک ناقدانہ تالیف۔ فکر اقبال کے متعلق جناب پرویز کا مطالعہ۔ اسلامی معاشرت (جو بچوں، عورتوں اور کم تعلیمیافتہ لوگوں کیلئے لکھی گئی ہے) نیز معارف القرآن کی پانچویں جلد دو ضخیم حصوں میں۔ یہ اور اس قسم کی اور کتابیں اشاعت کا انتظار کر رہی ہیں۔ ان کی اشاعت آپ کی معاونت کے بغیر ناممکن ہے۔ آپ سوچئے کہ اس باب میں آپ کا فریضہ کیا ہے؟۔

باسمہٖ تعالیٰ

تنقید مضامین احادیث نزولِ عیسیٰ علیہ السلام

(علامہ تمنا عمادی صاحب)

(قسط ششم)

صحاح کی کتابوں میں سے نسائی میں تو نزول عیسیٰ بن مریم علیہما السلام یا آمد مہدی کے متعلق کوئی حدیث مروی ہی نہیں ہے۔ بخاری و مسلم و ترمذی اور ابوداؤد کی سب حدیثوں کی تنقید ہو چکی۔ ابن ماجہ میں سے بھی نوّاس بن سمعان خود ساختہ صحابی کی طرف منسوب حدیث پر ناقدآ بحث مسلم و ترمذی کی حدیث کے ساتھ گذر چکی۔ مگر ابن ماجہ میں بھی حضرت ابوہریرہؓ کی طرف منسوب ایک حدیث ہے جس کو ابن ماجہ ابوبکر بن شیبہ سے وہ سفیان بن عیینہ سے، وہ زہری سے وہ سعید بن المسیب سے اور وہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ یہ حدیث بالکل اسی اسناد سے صحیح مسلم میں بھی مروی ہے وہاں امام مسلم عبدالاعلیٰ بن حماد، اور زہیر بن حرب کے ساتھ ابوبکر بن شیبہ سے یعنی ان تینوں سے اس کو سنتے ہیں اور یہاں ابن ماجہ تنہا ابوبکر بن شیبہ سے سنتا بیان کرتے ہیں۔ مگر پھر بھی الفاظ حدیث میں تقدیم و تاخیر کا کچھ فرق موجود ہے مثلاً مسلم میں ہے اماماً مقسطاً وحکماً عدلاً۔ اور ابن ماجہ میں ہے حکماً مقسطاً و اماماً عدلاً۔ یقیناً اتنا فرق امام مسلم اور ابن ماجہ کے حافظہ کے فرق کی وجہ سے ہے ورنہ دونوں ہی تو ابوبکر بن شیبہ ہی سے روایت کر رہے ہیں۔ اس حدیث پر پوری بحث صحیح بخاری کی حدیث سے مقابلہ کرتے ہوئے گذر چکی ہے۔ ولا فائدۃ فی الاعادۃ۔ اور اس کے رجال بھی وہی ہیں جو مسلم کے رجال ہیں جن کی تنقید ہو چکی، اس لئے یہاں رجال کی بھی بحث کا اعادہ فضول ہے۔

ایک نئی حدیث ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی مروی ہے۔ جو صحاح کی کسی دوسری کتاب میں مذکور نہیں۔ اس کو ابن ماجہ محمد بن بشار سے، وہ یزید بن ہارون سے، وہ عوام بن حوشب سے، وہ جبلہ بن سحیم سے، وہ موثر بن عفازہ سے اور وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا کہ جب ہوئی وہ رات جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سیر کرائی گئی (یعنی شب معراج) تو آپ نے ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ (علیہم السلام) سے مذاقات کی تو ان سب لوگوں نے باہم قیامت کا مذاکرہ کیا تو ابتدا کی ابراہیمؑ سے، تو سبھوں نے ان سے پوچھا تو ان کے پاس اس کے متعلق کوئی علم نہ تھا۔ پھر پوچھا موسیٰؑ سے، ان کے پاس بھی اس کے متعلق کوئی علم نہ تھا تو سبھوں نے اس سوال کو عیسیٰؑ کے پاس پیش کیا تو انھوں نے کہا کہ مجھ کو ذمہ دار بنایا گیا ہے ان باتوں کا جو قیامت کے قریب ہوں گی۔ لیکن اس کے وقوع کا علم اللہ کے سوا اور کسی کو نہیں۔ پھر عیسیٰؑ نے ذکر کیا خروج دجال کا۔ اور کہا کہ پھر میں اتروں گا اور اس کو قتل کروں گا۔ پھر لوگ اپنے اپنے شہروں کی طرف لوٹ جائیں گے، تو پھر ان کے سامنے آئیں گے یاجوج و ماجوج۔ اور وہ ہر ٹیلے سے نکلنے لگیں گے، تو وہ جس پانی کے پاس بھی گذریں گے اس کو پی جائیں گے اور جس چیز کے پاس پہنچیں گے اس کو تہس نہس کر ڈالیں گے۔ تو لوگ اللہ کے آگے گڑگڑائیں گے تو میں اللہ سے دعا کروں گا

کہ ان (یاجوج وماجوج کی قوم) کو موت دیدے، تو (جب وہ سب مرجائیں گے) زمین میں بدبو ہوجائیگی، ان کی (لاشوں کی) مہک سے۔ تو (پھر) لوگ اللہ کے سامنے گڑگڑانے لگیں گے، تو میں اللہ سے دعا کروں گا تو بھیجے گا اللہ بدلی کو پانی کے ساتھ، تو (وہ پانی) بہالے جائے گا ان (کی لاشوں) کو، پھر ڈالدیگا ان کو دریا میں۔ پھر پہاڑ چکنا چور ہوجائیں گے اور کھینچی جائے گی زمین جس طرح کھال کھینچی تانی جاتی ہے۔ تو مجھ کو رازدار بنایا ہے اس کا کہ جب یہ سب باتیں ہوجائیں گی تو قیامت لوگوں کے لئے اس حاملہ عورت کی طرح ہوگی (جس کے نو مہینے پورے ہوچکے ہوں) کہ اس کو لوگ نہیں جانتے کہ کس وقت وہ اچانک جن دیگی۔

اس حدیث کے راویوں میں سب سے پہلے جن کا نام آتا ہے وہ محمد بن بشار ہیں جن کا لقب بندار مشہور ہے جن سے ابن ماجہ اس حدیث کو روایت کرتے ہیں۔ ان کا ذکر ابوسریحہ کی طرف جو حدیث منسوب کی گئی ہے اس کے راویوں کی تنقید میں آچکا ہے۔ اسلئے ان کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں اسی قدر کافی ہے کہ تہذیب التہذیب ج ۹ ص۷۱ میں ابن حجر لکھتے ہیں کہ عمرو بن علی الباہلی (جو بخاری و مسلم کے متفق علیہ شیخ ہیں) قسم کھا کر کہتے تھے کہ بندار (یہ محمد بن بشار کا لقب تھا) کاذب ہیں ان حدیثوں میں جن کو وہ یحییٰ سے روایت کرتے ہیں۔ تو جب ایک شیخ کی حدیث میں ان کا کذب ثابت ہوچکا تو دوسرے شیوخ کی حدیثوں کے متعلق ان کا کیا اعتبار رہا؟ پھر علی بن المدینی نے بھی ان کی ایک حدیث کو جسے یہ عبدالرحمٰن بن مہدی سے روایت کرتے تھے، سن کر کہا کہ ھذا کذبٌ اور نہایت سختی کے ساتھ اس روایت سے انکار کیا۔ اور یحییٰ بن معین اور قواریری بھی ان کو ضعیف قرار دیتے تھے اور انھیں قابل اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے بعد اس حدیث کے بقیہ رجال کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ مگر اتنا لکھدینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جبلہ بن سحیم اور موثر بن عفازہ یہ دونوں کوفی تھے اور انھیں دونوں سے یہ حدیث چلتی ہے۔ موثر کا سال وفات ہماری کتابوں میں مذکور نہیں۔ شیعوں کی کتاب رجال الرجال الکبیر میں ان کا نام ہے اور سال وفات ۱۲۲ھ ہے اور جبلہ کا سال وفات تہذیب التہذیب میں ۱۲۵ھ لکھا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی وفات ۳۲ھ یا ۳۳ھ میں ہے یعنی موثر کی وفات سے تقریباً نوے برس پہلے۔ معلوم نہیں کس عمر میں موثر بن عفازہ نے یہ حدیث حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے سنی تھی۔ غالباً انھیں وجوہ کی بناپر صحاح کے دوسرے جامعین نے اس حدیث کو اپنی کتاب میں داخل نہیں کیا۔

اور ایک بڑی ہی چوڑی حدیث ابن ماجہ میں اور ہے۔ جس کو ابن ماجہ علی بن محمد بن اسحاق الکوفی سے جو ابوالحسن الطنافسی کے نام سے بھی پکارے جاتے تھے، روایت کرتے ہیں اور انھوں نے ابومحمد عبدالرحمٰن المحاربی سے، انھوں نے اسمٰعیل بن رافع سے جن کی کنیت ابورافع تھی انھوں نے ابوزرعۃ الشیبانی سے جن کا نام یحییٰ بن ابی عمرو تھا۔ اور انھوں نے حضرت ابوامامہ الباہلی رضؓ سے روایت کی کہ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا ہم لوگوں کے سامنے، اور آپ کا اکثر خطبہ ایسا ہی ہوتا تھا جس میں آپ ہم لوگوں سے دجال کے متعلق باتیں بیان فرماتے تھے اور ہم لوگوں کو اس سے ڈراتے تھے۔ تو آپ کی باتوں میں سے ایک بات یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب سے اللہ نے زمین پر آدم کی اولاد کو پھیلایا اس وقت سے کوئی فتنہ دجال کے فتنے سے بڑا زمین پر نہ ہوگا۔ اور یہ کہ اللہ نے کسی نبی کو مبعوث نہیں فرمایا مگر اس نے اپنی امت کو دجال (کے فتنے) سے ڈرایا۔ اور میں آخری نبی ہوں اور تم لوگ آخری امت ہو اور وہ لامحالہ تمہیں لوگوں میں نکلنے والا ہے۔ اور اگر وہ نکلے اور میں تم لوگوں کے درمیان موجود رہوں تو میں طرفدار ہوں گا ہر مسلم کا۔ اور اگر وہ میرے بعد نکلا تو ہر شخص اپنا حمایتی خود ہے، اور

اللہ میری غیبت میں ہر مسلم کے لئے میرا کام بنانے والا ہے۔ اور وہ نکلے گا شام و عراق کے درمیانی راستے سے پھر داہنے بائیں فتنہ و فساد پھیلاتا رہے گا۔ اے اللہ کے بندو تم ثابت قدم رہنا۔ لو میں اس کی ایسی صفتیں بیان کئے دیتا ہوں جن کو کسی نبی نے مجھ سے پہلے نہیں بیان کیا ہے۔ وہ شروع کریگا اس قول سے کہ میں نبی ہوں، حالانکہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ پھر دہرائیگا اور کہے گا میں تم لوگوں کا رب ہوں حالانکہ تم نہیں دیکھ سکتے اپنے رب کو جبتک مر نہ لو۔ اور یہ کہ وہ کانا ہوگا اور تمہارا رب کانا نہیں ہے۔ اور یہ کہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان "کافر" لکھا ہوا ہوگا جس کو ہر پڑھا لکھا اور ان پڑھ مومن پڑھ لیگا۔ اور اس کے فتنوں میں سے ایک فتنہ یہ ہوگا کہ اس کے ساتھ جنت و دوزخ ہوں گے تو اس کا دوزخ جنت ہوگا اور اس کی جنت دوزخ ہوگی۔ تو جو شخص اس کے دوزخ میں مبتلا کیا جائے اس کو چاہئے کہ اپنے رب سے مدد مانگے اور اوائل سورۂ کہف کی آیتیں پڑھے تو وہ آگ اس کیلئے بَرْدٌ و سلام (ٹھنڈک اور سلامتی) ہو جائے گی۔ جس طرح ابراہیمؑ کے لئے ہوگئی تھی۔ اور اس کے فتنوں میں سے ایک فتنہ یہ ہوگا کہ وہ ایک اعرابی سے کہے گا کہ کیا تو مناسب سمجھتا ہے کہ میں تیرے باپ ماں کو زندہ اٹھا دوں جب تو تو گواہی دے گا کہ میں تیرا رب ہوں؟ تو وہ کہے گا کہ ہاں۔ تو دو شیطان اس کے باپ ماں کی شکل میں آکر کھڑے ہو جائیں گے اور کہیں گے کہ اے میرے پیارے بیٹے اس کی پیروی کر یہ تیرا رب ہے۔ اور اس کے فتنوں میں سے ایک فتنہ یہ ہوگا کہ کسی ایک شخص کو پکڑیگا اور اس کو قتل کر دے گا اور اس کو آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کر دے گا، اور (لوگوں سے) کہے گا، دیکھو میرے اس بندے کی طرف میں اس کو ابھی زندہ کر کے اٹھاتا ہوں، پھر بھی یہ اسی بدگمانی میں رہتا ہے کہ میرے سوا اس کا کوئی دوسرا رب ہے تو اللہ اس (دو ٹکڑے لاش) کو زندہ کر دے گا، تو پوچھے گا اس سے وہ خبیث، کہ تیرا رب کون ہے؟ تو وہ کہے گا کہ میرا رب اللہ ہے اور تو اللہ کا دشمن ہے، تو دجال ہے، اللہ کی قسم آج پہلے سے زیادہ مجھ کو تیرے متعلق بصیرت حاصل ہے۔ ابوالحسن الطنافسی (ابن ماجہ کے شیخ جن سے یہ حدیث وہ روایت کر رہے ہیں) نے کہا کہ مجھ سے بیان کیا محمد المحاربی نے (کتابت کی غلطی سے "ابو" کا لفظ چھوٹ گیا ہے، صحیح ابو محمد المحاربی ہے جن سے یہ حدیث ابوالحسن الطنافسی روایت کر رہے ہیں۔ ان کا پورا نام عبدالرحمن بن محمد بن زیاد ہے۔ ابو محمد کنیت ہے) ابو محمد المحاربی نے کہا کہ ہم سے بیان کیا عبید اللہ بن الولید الوصافی نے۔ انھوں نے عطیہ (العوفی) سے، انھوں نے ابو سعید سے۔ کہ ابو سعید نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ شخص (جس نے دجال کو کھری کھری سنائی) میری امت میں سے جنت کے سب سے بلند درجے والا ہوگا۔ (عطیہ نے) کہا کہ ابو سعید نے کہا کہ اللہ کی قسم ہم لوگ اس شخص کے بارے میں سمجھتے تھے کہ وہ عمر بن الخطابؓ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا یہانتک کہ پھر وہ اپنی راہ سے لگے گا۔ (ابو محمد) المحاربی نے کہا (اتنا جملہ معترضہ بیان کر کے) ہم پھر ابو رافع کی حدیث کی طرف لوٹتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اور اس کے فتنوں میں سے ایک فتنہ یہ ہوگا کہ وہ حکم دے گا بدلیوں کو کہ برسیں تو برسنے لگیں گی، اور حکم دیگا زمین کو کہ اُگائے تو وہ اگانے لگے گی۔ اور اس کے فتنوں میں سے ایک فتنہ یہ ہوگا کہ وہ گذرے گا ایک قبیلے کے پاس تو وہ لوگ اس کو جھٹلائیں گے تو ان کے سارے مویشی مر جائیں گے۔ اور اس کے فتنوں میں سے ایک فتنہ یہ ہوگا کہ وہ گذرے گا ایک قبیلے کے پاس تو وہ لوگ اس کی تصدیق کریں گے تو وہ حکم دے گا بدلیوں کو کہ برسیں تو وہ برسنے لگیں گی اور حکم دیگا زمین کو کہ اگائے تو وہ اگانے لگے گی یہانتک کہ چلیں گے ان کے مویشی اس دن سے جس قدر تھے اس سے کہیں زیادہ فربہ تیار بڑے بڑے پاکھے والے اور دودھ سے بھرے بھرے تھن والے

اور زمین کا کوئی حصہ ایسا نہ ہوگا جس کو وہ پامال نہ کرے گا اور اس پر غالب نہ آئے گا سوائے مکے اور مدینے کے۔ ان دونوں کے دروں .. (پہاڑی راستوں) میں سے کسی درے سے بھی وہ گذرنا چاہے گا تو تلواریں تولے ہوئے فرشتے اس کو ملیں گے۔ یہانتک کہ وہ اترے گا ضریب احمر کے قریب، منقطع سبخہ کے نزدیک۔ (ضریب احمر سے مراد تاریکی شب مجشی لکھتے ہیں اور بعضوں نے کہا ہے کہ وہ ایک پہاڑی ہے جو زمین پر پھیلی ہوئی ہے سبخہ بنجر زمین ناقابل کاشت کو کہتے ہیں مجشی "منقطع السبخہ" سے مراد لکھتے ہیں وہ سرزمین جو مدینے سے باہر ہے) تو زلزلے میں آجائے گا مدینہ اپنے لوگوں سمیت تین بار۔ تو کوئی منافق مرد یا عورت، ایسا نہ ہوگا جو اس کی طرف نکل نہ جائیگا۔ تو خباثت مدینے سے نکل جائے گی جیسے لوہار کی انگیٹھی لوہے کی خباثت (زنگ) کو دور کر دیتی ہے اور یہ دن یوم الخلاص کے نام سے پکارا جائے گا۔ تو پوچھا ام شریک بنت ابی العکر نے یا رسول اللہ! اس دن یہ سارے عرب کہاں ہوں گے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ اس دن تھوڑے ہوں گے۔ اور وہ سب کے سب بیت المقدس میں ہوں گے اور ان کا امام ایک مرد صالح ہوگا۔ تو ان کا امام صبح کی نماز پڑھانے کے لئے بڑھا ہی ہوگا کہ اسی درمیان میں عیسیٰ بن مریم صبح کو اچانک اتر آئیں گے۔ تو یہ امام اپنی جگہ سے پچھلے پاؤں پیچھے چلا آئے گا، تاکہ عیسیٰ آگے بڑھکر نماز پڑھائیں۔ تو عیسیٰ اس کے دونوں شانوں کے درمیان اپنا ہاتھ رکھ کر کہیں گے کہ تم آگے بڑھو کیونکہ یہ جماعت تمہارے ہی لئے کھڑی ہوئی ہے تو ان کا امام نماز پڑھائے گا۔ تو جب وہ فارغ ہوگا عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے کھولو دروازہ، تو کھولا جائے گا اور اس کے پیچھے ستر ہزار یہودیوں کے ساتھ دجال ہوگا اور وہ سب تلوار اور ساز و سامان سے لیس ہوں گے۔ تو جب دیکھے گا ان (عیسیٰ) کی طرف دجال پگھلنے لگے گا جس طرح نمک پگھلتا ہے۔ پانی میں اور ٹل جائے گا بھاگتا ہوا۔ اور کہیں گے عیسیٰ کہ میرے پاس تیرے متعلق ایک ضرب ہے جس سے سبقت لیجا کر تو مجھ سے نکل نہیں جا سکتا تو پکڑیں گے اس کو دروازہ لُد کے پاس جو مشرق کی طرف ہے اور قتل کریں گے اس کو۔ پھر شکست دیگا اللہ یہود کو۔ تو اللہ نے جتنی چیزیں پیدا کی ہیں ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہ ہوگی جس کے پیچھے کوئی یہودی جا کے چھپے اور اس کو اللہ گویائی کی طاقت نہ دیدے کہ وہ بتادے چاہے وہ شجر ہو یا حجر، دیوار ہو یا کوئی جانور بجز درخت غرقد کے (یہ بڑا درخت شام اور مدینے کے اطراف میں ہوتا ہے۔ مقبرہ بقیع میں پہلے اس کے متعدد درخت تھے اسی لئے اس مقبرے کو بقیع الغرقد کہتے تھے) کیونکہ وہ انھیں کا درخت ہے اسلئے وہ کچھ نہ بولے گا۔ اسکے سوا ہر چیز پکار کر کہے گی کہ اے اللہ کے بندے مسلم! یہ یہودی ہے، آؤ اور اس کو قتل کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس (دجال) کے ایام چالیس برس ہوں گے۔ ایک سال نصف سال کے برابر اور ایک سال ایک مہینے کے برابر اور ایک مہینہ ایک جمعہ (یعنی ہفتہ) کے برابر اور اس کے آخر ایام مثل شرر کے ہونگے (یعنی بقدر فرصت یک شرر) تم میں کا ایک شخص مدینے کے دروازے پر صبح کریگا تو دوسرے دروازے تک پہنچتے پہنچتے شام ہو جائے گی۔ تو آپ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ ہم اتنے چھوٹے دنوں میں کس طرح نماز پڑھیں گے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اندازہ مقرر کرلیں گے آجکل کے بڑے دنوں کے انداز کے مانند اور (اسی اندازے کے مطابق) نماز پڑھو گے۔ (پھر) رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ ہوں گے عیسیٰ بن مریم میری امت میں حاکم عادل اور امام منصف۔ چکنا چور کریں گے صلیب کو اور ذبح کریں گے خنزیر کو اور موقوف کرینگے جزیہ کو اور چھوڑ دیں گے صدقہ کو۔ پس نہیں سعی کریں گے (زکوٰۃ تحصیلنے والے) کسی بکری یا اونٹ پر (اس کی زکوٰۃ وصول کرنے کیلئے) اور عداوت و بغض اٹھا لیا جائے گا اور زہر ہر زہریلی چیز سے کھینچ لیا جائے گا۔ یہانتک کہ ایک بچہ سانپ کے منہ میں ہاتھ دیدیگا اور اس کو وہ کچھ ضرر نہیں پہنچائیگا۔ اور ایک بچی شیر کا منہ چیر کر اس کے دانت دیکھے گی اور وہ اسے نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اور بھیڑیا بھیڑ کے لئے ایسا ہوگا گویا

کہ وہ اس کا کتنا ہے۔ اور بھر جائے گی زمین مسلمانوں سے جس طرح برتن پانی سے بھر جاتا ہے، تو ایک ہی کلمہ رہے گا۔ اور اللہ کے سوا کوئی پوجا نہیں جائے گا۔ اور جنگ اپنے ہتھیار رکھدے گی اور سلب کرلیں گے قریش اپنے ملک کو۔ اور ہو جائے گی زمین چاندی کے طشت کی طرح اگائے گی اپنے پودوں کو مثل زمانہ آدمؑ کے، یہانتک کہ انگور کے ایک گچھے پر ایک جماعت مجتمع ہوگی تو وہ ایک گچھا ان سبھوں کو سیر کردیگا۔ اور ایک جماعت ایک انار پر مجتمع ہوگی اور وہ ان سبھوں کو سیر کردیگا اور گائے اتنے اتنے مال پر ملے گی اور گھوڑا چند چھوٹے سکوں پر۔ لوگوں نے کہا کہ کونسی بات گھوڑے کو سستا کردے گی؟ آپ نے فرمایا کہ گھوڑا نہیں چڑھا جائے گا لڑائی میں کبھی۔ پھر کہا گیا آپ سے کہ کونسی بات مہنگی کردے گی گائے کو؟ آپ نے فرمایا کہ وہ جوت ڈالے گی ساری زمین۔ اور بیشک خروج دجال سے پہلے تین برس بہت سخت گزریں گے جن میں لوگ سخت فاقہ کشی کی مصیبت اٹھائیں گے۔ پہلے سال میں اللہ آسمان کو حکم دیگا کہ ایک تہائی بارش روک دے، اور زمین کو حکم دیگا کہ ایک تہائی نباتات کو روک دے۔ پھر حکم دے گا دوسرے سال آسمان کو کہ دو تہائی بارش کو روک دے اور حکم دیگا زمین کو کہ دو تہائی نباتات کو روک دے۔ پھر حکم دے گا تیسرے سال آسمان کو تو وہ کل بارش کو روک دیگا اور زمین کو تو وہ کل نباتات کو روک دیگی۔ تو وہ کوئی سبز گھاس زمین پر نہ اُگے گی۔ تو کوئی کُھر والا جانور ایسا نہ ہوگا جو ہلاک نہ ہو جائے۔ مگر جس کو اللہ چاہے تو پوچھا گیا کہ کون سی چیز انسان کو اس زمانے میں زندہ رکھے گی؟ تو آپ نے فرمایا کہ تہلیل و تکبیر و تسبیح و تحمید۔ اور یہی چیزیں ان کیلئے غذا کی قائم مقام ہوں گی۔

ابو عبداللہ نے کہا کہ میں نے ابوالحسن الطنافسی سے سنا کہ وہ کہتے تھے کہ میں نے عبدالرحمٰن المحاربی کو یہ کہتے سنا کہ چاہئے یہ حدیث معلمین کو دی جائے کہ لڑکوں کو اس کی تعلیم دیں کتاب میں۔ یہ سنن ابو عبداللہ بن ماجہ کی اس حدیث کا ترجمہ ہوا جس کو ابوامامہ باہلیؓ کی طرف منسوب کرکے ابورافع اسمعیل بن رافع قاضی مدنی نے عبدالرحمٰن المحاربی سے بیان کیا اور انھوں نے علی بن محمد ابوالحسن الطنافسی سے بیان کیا، اور انھوں نے ابن ماجہ صاحب السنن سے بیان کیا۔ یہ حدیث بھی عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث کی طرح صحاح کی کسی اور کتاب میں نہیں ہے۔ صرف اسی ابن ماجہ میں ہے۔ اس حدیث کے اصل راوی اسمعیل بن رافع ابورافع القاضی المدنی ہیں جن کو عمرو بن علی الباہلی جو بخاری و مسلم کے متفق علیہ شیخ ہیں منکر الحدیث کہتے ہیں اسی طرح ابوحاتم نے بھی ان کو منکر الحدیث کہا ہے۔ ابن معین ان کو لیس بشئ کہتے ہیں یعنی یہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ ترمذی لکھتے ہیں کہ بعض اہل علم نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے۔ نسائی نے ان کو ایک بار ضعیف کہا۔ دوسری بار لیس بشئ کہا۔ تیسری بار متروک الحدیث کہا اور چوتھی بار لیس بثقۃ کہا۔ ابن خراش اور دارقطنی نے بھی ان کو متروک کہا۔ ابن عدی نے کہا کہ ان کی ہر حدیث محل تامل ہے، بہرحال ضعفاء کے زمرے میں ان کی حدیث لکھ لی جائے۔ ابن سعد نے کہا کہ کثیر الحدیث ہیں ضعیف ہیں۔ عجلی نے ضعیف الحدیث کہا۔ حاکم نے کہا کہ محدثین کے نزدیک یہ قوی نہیں ہیں۔ علی بن الجنید نے کہا کہ متروک ہیں۔ یعقوب بن سفیان نے ان کا ذکر ان لوگوں میں کیا ہے جن لوگوں سے روایت کرنے سے اعراض کرنا چاہئے۔ بزار نے کہا کہ نہ یہ ثقہ ہیں نہ حجت۔ اور ابوحاتم، عقیلی، ابوالعرب، محمد بن احمد المقدمی، محمد بن عبداللہ بن عمار، ابن الجارود، ابن عبدالبر، ابن حزم اور خطیب وغیرہم نے بھی ان کو ضعیف الحدیث قرار دیا ہے۔ ابن حبان نے کہا کہ آدمی تھے تو صالح مگر حدیثوں کو اس طرح الٹ پلٹ کردیا کرتے تھے کہ ان کی حدیثوں میں غلبہ منکرات ہی کی رہتا ہے۔ اس حد تک کہ دل یہ کہتا ہے کہ یہ قصداً ایسا کرتے تھے۔ اور آجری نے بھی ان کو لیس بشئ کہا ہے یعنی یہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ انھوں نے زہری سے

کچھ حدیثیں سنی تھیں مگران کی کتاب ضائع ہوگئی، تو جب کوئی کتاب دیکھی تو کہہ دیا کرتے تھے کہ ہم نے اس کو سنا ہے۔ (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۹۶)
ان چوبیس ائمہ رجال کی ایسی کھلی کھلی دہری تہری جرحوں کے بعد ان کی کیا حیثیت رہتی ہے اور ان کی روایت کردہ جو صرف انھیں کی روایت کردہ حدیث ہو اس حدیث کی کیا حیثیت رہتی ہے۔ اہل انصاف خود ٹھنڈے دل سے سوچ کر بیان فرمائیں۔ ع

ہم اگر عرض کرینگے تو شکایت ہوگی

مضامینِ حدیث پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجئے۔ حدیث کا ہے کو ہے داستان امیر حمزہ ہے۔ مدینے میں تین بار زلزلہ آئے گا اور سارے منافقین مرد و عورت سب کے سب مدینے سے نکل جائیں گے اور مدینہ خباثتوں سے پاک ہو جائے گا یعنی صرف سچے مومنین ہی وہاں رہ جائیں گے مگر ام شریک بنت ابی العکر کے پوچھنے پر فرمایا جاتا ہے کہ سارے اہل عرب (سچے مومنین) بیت المقدس (شام) میں ہوں گے۔ شاید اس وقت مدینے پر صرف عجمی مومنین کا قبضہ ہوگا۔ اور سارے اہل عرب مومنین کو وہ اہل عجم مومنین مدینے سے نکال دیں گے۔ کیا یہ ممکن ہے؟ کیا اس کا تصور بھی کیا جاسکتا ہے؟ کیا سچے مومنین کی یہی شان ہے؟ ورنہ یہ کہنا تھا کہ مدینے میں زلزلے آئیں گے تو سارے اہل مدینہ مومنین و منافقین مرد و عورت سب کے سب مدینہ چھوڑ کر باہر نکل جائیں گے۔ منافقین تو دجال کے ساتھ ہو جائیں گے اور مومنین صادقین شام میں پہنچ کر بیت المقدس کے پاس پناہ گزین ہو جائیں گے۔ مگر یہ تو کہا نہیں گیا۔ کہا گیا مدینے سے صرف منافقین کے نکل جانے کے متعلق۔ تو پھر مومنین مدینے میں ہوں گے یا بیت المقدس کے پاس شام میں؟

آغاز حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم کا اکثر خطبہ ایسا ہوتا تھا جس میں دجال کا ذکر ہوتا تھا۔ خطباتِ نبویہ کے مطبوعہ نسخے چھپے ہوئے ملتے ہیں جس کا جی چاہے دیکھ لے اور اس قول کے صدق و کذب کا امتحان کرلے۔

ہر نبی نے اپنی امت کو دجال سے ڈرایا اور پھر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بقول راویانِ حدیث اپنی امت کو ڈرایا اور بہت ڈرایا اور بار بار ڈرایا جیسا کہ اس حدیث میں مذکور ہے۔ مگر کسی نبی نے اپنے جی سے تو ڈرایا نہ ہوگا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی وحی کے مطابق ہی ڈرایا تھا اور ہر نبی کو بذریعۂ وحی کتاب اللہ ہی ملی تھی، لیکن کسی کتاب میں بھی دجال کا ذکر نہیں۔ اگلی کتابوں کے صحیح نسخے ملتے کہاں ہیں۔ اگر اگلی کتابوں میں سے کسی کتاب میں کسی بات کا ذکر ہو تو گمان ہو سکتا ہے کہ یہ مضمون اس میں داخل کر دیا گیا اگر کوئی مضمون نہ ملے تو کہا جاسکتا ہے کہ اصل کتاب میں یہ مضمون ضرور تھا بعد کو لوگوں نے نکال دیا۔ مگر قرآن مجید تو ہر طرح کی کمی بیشی سے محفوظ موجود ہے۔ آخر اس میں دجال کے آنے کا کیوں ذکر نہیں۔ رسول اللہ صلعم کو تو حکم تھا کہ فذکر بالقرآن من یخاف وعید۔ اس قرآن کے ذریعے ان لوگوں کو نصیحت کرو جو میری وعید سے ڈرتے ہیں۔ (آخر سورۂ قاف) اور اواخر سورۂ مریم میں فرمایا گیا فانما یسرنٰہ بلسانک لتبشر بہ المتقین وتنذر بہ قوماً لدا۔ میں نے اس (کتاب قرآن) کو تمہاری زبان میں آسان بنا دیا ہے تاکہ تم اس کے ذریعے متقین کو خوشخبری سناؤ اور اس کے ذریعے جھگڑالو قوم کو ڈراتے رہو۔ غرض تذکیر، تبشیر اور تنذیر یہی تین کام نبی ورسول کے ہیں۔ آنحضرت صلعم کو ان تین کاموں میں قرآن کا پابند فرمایا گیا ہے۔ کہ جو کچھ کرو اسی قرآن سے کرو۔ جو بات قرآن میں اشارۃً کنایۃً کسی طرح بھی مذکور نہیں اس کا ذکر آپ اپنے جی سے کس طرح فرما سکتے تھے۔ یقیناً یہ ساری حدیثیں لوگوں کی من گھڑت ہیں جن کے بہتان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر باندھے گئے۔ معاذ اللہ من تلک الہفوات۔

آگے چل کے اس حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ مسلمانوں ہی میں کا ایک مردِ صالح امام ہوگا اور آخر ہی امامت کریگا اور وہی نماز پڑھائے گا۔ اس کا مطلق ذکر نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ بھی اس جماعت میں شریک ہوکر اس امام کے مقتدی بنیں گے یا نہیں۔ یا وہ جماعت سے الگ ہی نماز تنہا ادا کریں گے؟ اور پھر جس حدیث میں حضرت عیسیٰؑ ہی کی امامت کا ذکر ہے اس سے تعارض الگ ہے۔

اس حدیث میں ہے کہ دجال کا زمانہ چالیس برس تک رہے گا۔ جس میں سے پہلا سال نصف سال کے برابر یعنی چھ مہینوں کا ہوگا۔ اور ایک سال صرف ایک مہینے کے برابر۔ اور اس کا ایک مہینہ ایک ہفتہ کے برابر ہوگا اور باقی سارے ایام بقدر فرصت یک شرر دو ایک ہی ساعت کے برابر ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی طرف منسوب کردہ جو حدیث مسلم میں ہے جو پہلے بیان ہو چکی، اس میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ "میری امت میں دجال آئیگا تو چالیس تک ٹھہریگا۔ میں نہیں جانتا کہ چالیس دن یا چالیس مہینے یا چالیس برس۔

اور نواس بن سمعان ایک خودساختہ صحابی کی طرف جو حدیث منسوب کی گئی ہے جو صحیح مسلم، ترمذی، ابوداؤد، اور سنن ابن ماجہ یعنی صحاح کی چار چار کتابوں میں ہے، جس کی تنقید اوپر گذر چکی۔ اس میں ہے کہ نواس بن سمعان کہتے ہیں کہ ہم لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! وہ (دجال) کتنے تک زمین پر رہے گا؟ تو آپ نے فرمایا کہ چالیس دن۔ ایک دن ایک سال کے برابر ایک دن ایک مہینے کے برابر ایک دن ایک جمعہ (ہفتہ) کے برابر ہوگا اور اس کے باقی دن تم لوگوں کے دنوں کے برابر ہوں گے۔ اس حساب سے روئے زمین پر دجال کی اقامت ۴۳۴ دن یعنی چودہ مہینے اور چودہ دنوں تک تقریباً رہے گی۔

مگر اس حدیث میں اس کا الٹا ہے یعنی نواس بن سمعان دجال کی مدت اقامت صرف چالیس دن بتاتے ہیں جن میں سے صرف تین دن غیرمعمولی لمبے ہوں گے، پہلا دن ایک سال کا دوسرا ایک ماہ کا اور تیسرا صرف ایک ہفتے کا۔ اور باقی سب دن دستورِ زمانہ کے مطابق رہیں گے اور ابو رافع قاضی مدینہ حضرت ابوامامہ باہلیؓ کے شانۂ مبارک پر روایت کی بندوق رکھکر بزعم خود جو حدیث کی فیر کرتے ہیں اس میں دجال کی مدت اقامت چالیس برس بتائی ہے وہاں دن لمبے کئے گئے ہیں تو یہاں برس چھوٹے کئے گئے۔ چالیس برس میں کا پہلا سال چھ ماہ کا ہوگا اور دوسرا ایک ماہ کے برابر اور تیسرا ایک ہفتہ کے برابر۔ وہاں چالیس دنوں میں سے تین دن تو کم و بیش لمبے ہوں گے۔ باقی سب دن عام دنوں کے برابر ہوں گے۔ اور یہاں چالیس برسوں میں سے تین برس تو کم و بیش چھوٹے چھوٹے ہوں گے اور باقی برسوں کے دن چنگاری کی طرح اڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس قدر مختصر ہو جائیں گے۔ ان کے حساب سے دجال کی مدت اقامت کہنے کو تو چالیس برس تک ہوگی مگر وہ عام مروجہ حساب کے مطابق صرف سات مہینے سولہ دن تیس منٹ ہوگی۔ اگر پہلے سال کو چھ مہینے کے برابر اور دوسرے سال کو ایک ماہ کے برابر اور تیسرے سال کو ایک ہفتہ کے برابر قرار دے کر باقی ۳۷ برس گیارہ مہینے کے دنوں کو بقدر فرصت یک شرر قرار دینے کے لئے صرف ایک منٹ کا ایک دن تسلیم کر لیجئے۔ اب کوئی روایت پرستوں سے پوچھے کہ ان میں سے کون سا بیان صحیح ہے؟ اور کس کے بیان کے مطابق دجال کی مدت اقامت پہ روایت پرستانہ ایمان لایا جائے۔ بینوا، توجروا۔

کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ تشریف لائیں گے تو زمین چاندی کے طشت کی طرح ہو جائے گی اور اپنے پودے اگانے لگے گی حضرت آدمؑ کے زمانہ کی طرح غالباً اس سے مراد یہ ہے کہ صبح کو لوگ بوئیں گے اور شام سے پہلے ہی کاٹ لیں گے اور رات کو پکا کر کھائیں گے۔ مگر پھر زمین چاندی کے

طشت کی طرح تو نہ ہوگی سبزوں کے رنگ کی مناسبت سے فیروزے کا طشت، پکھراج کا طشت یا شب کا طشت کہنا تھا۔

غرض ہر حدیث کا دجال اور ہر حدیث کے عیسیٰ بن مریمؑ ایک دوسرے سے مختلف معلوم ہوتے ہیں، البتہ چونکہ ہر حدیث کا دجال آخر دجال ہی ہے اور ہر حدیث کے عیسیٰ آخر عیسیٰ ہی ہیں اس لئے بہت سی باتوں میں سب دجالوں کے درمیان اور سب عیساؤں کے درمیان کہیں باہمی اتحاد کہیں باہمی مشابہت اور کہیں ادنیٰ ملابست ضرور معلوم ہوتی ہے۔ غرض ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا (اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت اختلافات لوگ پاتے) یہ آیت اس کی شاہد عادل ہے کہ یہ باتیں عیسیٰ بن مریمؑ اور خروج دجال کے متعلق یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی شدہ نہیں ہیں اسی لئے ان میں اس قدر اختلاف اور خلاف واقعیت باتیں ہیں اور جب اللہ کی طرف سے وحی شدہ نہیں ہیں تو یقیناً یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بھی نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ آپ اپنے جی سے بغیر وحی الٰہی کے کوئی پیشین گوئی نہیں فرما سکتے تھے۔ آپ تبلیغ و تبشیر و تذکیر و تنذیر تمام دینی خدمات مفوضہ میں قرآن مجید کے پابند تھے۔ قرآن مبین سے باہر دین کی کوئی بات آپ نے کبھی بیان نہیں فرمائی۔ اور نہ آپ اس کے مجاز تھے۔

اس حدیث کے درمیان میں ایک قول بطور جملہ معترضہ کے منقول ہے جو بروایت عطیۃ العوفی ابو سعید سے مروی ہے۔ سلسلہ روایت تقریباً وہی ہے جو اس حدیث کا ہے۔ ابن ماجہ کے شیخ اس میں بھی وہی ابو الحسن الطنافسی ہیں جن کا نام علی بن محمد ہے۔ اور ان کے شیخ بھی وہی ہیں ابو محمد عبد الرحمٰن المحاربی۔ ان کے بعد ابو رافع اسمٰعیل بن رافع کے عوض عبید اللہ بن الولید الوصافی کا نام آتا ہے جو ابو رافع کے بدل الکل ہیں۔ ابو رافع کو جو ۲۴ ماہرین رجال ائمہ حدیث سے سند ملی تھی اس کو تو آپ دیکھ چکے، اب ان وصافی صاحب کو ائمہ رجال سے جو سندیں ملی ہیں ان کو بھی ملاحظہ فرمایئے۔ حافظ ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۷ صـ ۵۵ میں عبد اللہ بن الولید الوصافی ابو اسمٰعیل الکوفی کا ترجمہ لکھتے ہیں، اس میں تحریر فرماتے ہیں کہ "ابو طالب نے امام احمد بن حنبل سے روایت کی کہ انھوں نے ان کے متعلق فرمایا کہ یہ مضبوط حدیث والے نہیں ہیں۔ ان کی حدیث محض شناخت کے لئے لکھ لی جائے۔ ابن معین، ابو زرعہ اور ابو حاتم نے کہا کہ یہ ضعیف الحدیث ہیں۔ اور ابن معین نے ان کے متعلق ایک بار کہا کہ لیس بشیء یہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ اور عمر ابن علی اور نسائی نے کہا کہ یہ متروک الحدیث ہیں اور نسائی نے ایک بار کہا کہ لیس بثقۃ یہ ثقہ نہیں ہیں۔ ان کی حدیث نہ لکھی جائے۔ عقیلی نے کہا کہ ان کی حدیث میں ایسی منکر باتیں ہیں جن کی متابعت نہیں ملتی۔ (یعنی ان کے سوا کوئی دوسرا اس قسم کی حدیثیں روایت نہیں کرتا) حرب بن اسمٰعیل نے امام احمدؒ سے پوچھا کہ ان کی حدیثیں کیسی ہیں تو انھوں نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ وہ کیسی ہیں۔ ابن عدی نے ان کی کچھ حدیثیں جنھیں انھوں نے محارب بن دثار السدوسی سے روایت کی تھیں لکھ کر لکھا ہے کہ یہ وصافی کی حدیثیں ہیں جن کو وصافی کے سوا کوئی بھی روایت نہیں کرتا۔ اور دوسری جگہ لکھا ہے کہ یہ یقینی ضعیف ہیں ان کی حدیثوں ہی سے ضعف ظاہر ہو رہا ہے۔ حاکم نے کہا کہ یہ محدثین کے نزدیک قوی نہیں ہیں۔ انھوں نے محارب سے موضوع حدیثیں روایت کی ہیں۔ ساجی نے کہا کہ ان کے پاس منکر حدیثیں بہت ہیں۔ یہ یقیناً ضعیف الحدیث ہیں، ان سے ابو نعیم روایت تو کرتے ہیں مگر باوجود اس کے فرماتے ہیں کہ یہ محارب سے منکر حدیثیں روایت کرتے ہیں۔ یہ کچھ بھی نہیں ہیں اور ابن حبان صاف کھل کر لکھتے ہیں کہ یہ ثقہ لوگوں سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہیں جو معتبر لوگوں کی حدیثوں سے ملتی جلتی نہیں یہاں تک کہ دل پر یہ بات گزرتی ہے کہ یہ قصداً ایسا کرتے ہیں اس لئے اس کے مستحق ہیں کہ ان کی حدیثیں ترک کر دی جائیں۔

اب آپ وصافی صاحب کو ابورافع قاضی سے ملا کر دیکھیں یہ کس بات میں قاضی صاحب سے کم ہیں؟ اسلئے جس سلسلہ اسناد میں قاضی صاحب ممدوح نہ ہوں تو ان کی جانشینی کے لئے ان سے بہتر کونسا آدمی مل سکتا ہے؟ اور سب سے بڑی سند ان کے پاس یہی ہے جو قاضی صاحب کو حاصل نہ تھی کہ یہ عطیہ بن جنادۃ العوفی کے شاگرد ہیں۔ ہم تنقید رجال کی بحث میں لکھ چکے ہیں کہ عطیہ کلبی کذاب کوفی کی من گھڑت حدیثوں کو حدثنا ابوسعید کہکر روایت کیا کرتا ہے تاکہ لوگ سمجھیں کہ یہ حضرت ابوسعید خدری مشہور صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت کر رہا ہے حالانکہ وہ روایت ہوتی ہے کلبی خبیث کی۔ کلبی کی کنیت خود اپنی طرف سے "ابوسعید" اس نے رکھدی تھی۔ حالانکہ کلبی کی یہ کنیت نہ تھی۔ تو یہ حضرت ابوامامہ الباہلی کی حدیث کے درمیان میں عطیہ کے ذریعے کلبی کوفی کا قول پیش کیکے ابوالحسن الطنافسی صاحب نے اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ اس حدیث کو عطیہ العوفی بھی کلبی کوفی سے حدثنا ابوسعید کہکر روایت کیا کرتا تھا۔ گویا اس طرح ایک متابعت بھی اس حدیث کی ضمناً پیش کر دی گئی۔ لیکن چور کا گواہ گرہ کٹ اگر ہو تو اس گواہی سے چور کا دعویٰ کبھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ یہاں درحقیقت ابورافع کی تائید ان کے جانشین عبیداللہ بن الولید الوصافی نے کی ہے۔ اور دونوں جیسے اسناد یافتہ راوی ہیں آپ کو معلوم ہو چکا

سر چڑھکر بولنے والا جادو

آخر حدیث میں سلسلہ اسناد کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ "ابوعبداللہ نے کہا کہ میں نے ابوالحسن الطنافسی سے سنا کہ وہ کہتے تھے کہ میں نے عبدالرحمٰن المحاربی کو یہ کہتے سنا کہ چاہئے کہ یہ حدیث معلمین کو دی جائے کہ لڑکوں کو اس کی تعلیم دیں کتاب میں"

حدیث کے سلسلۂ اسناد میں ابن ماجہ فرماتے ہیں کہ حدثنا علی بن محمد یعنی ابوالحسن الطنافسی تو ابوالحسن الطنافسی تو خود ابن ماجہ کے شیخ ہیں۔ یہاں یہ بات بلاواسطہ ابوالحسن الطنافسی سے ان کو نہیں پہنچی بلکہ کسی ابوعبداللہ کے واسطے سے پہنچی۔ تو وہ ابوعبداللہ کون ہیں؟ اس کا پتا لگانا ضروری ہو گیا۔ چنانچہ کتب رجال کی چھان بین کیجئے آپ کو ایسا کوئی شخص نہیں ملے گا جس کی کنیت ابوعبداللہ ہو اور وہ ابوالحسن الطنافسی سے روایت کرتا ہو اور اس سے ابن ماجہ روایت کرتے ہوں۔ تو پھر یہ صاحب کون ہیں جن کی کنیت ابوعبداللہ ہے جن سے ابن ماجہ روایت کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ابوعبداللہ خود حضرت ابن ماجہ ہی ہیں۔ ان کا پورا نام محمد بن یزید بن عبداللہ بن ماجہ القزوینی ہے۔ ابوعبداللہ ان کی کنیت ہے۔ ربیع بن عبداللہ کے غلام آزاد کردہ تھے۔ ۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۷۳ھ میں وفات پائی۔ تو یہاں ابن ماجہ خود اپنی ذات سے روایت کر رہے ہیں۔

آپ کو تعجب ہوگا کہ کوئی محدث خود اپنی ذات سے کس طرح روایت کریگا؟ بات یہ ہے کہ محدثین کی کتابوں میں ان کے تلامذہ کے مسودات بھی بعد کو داخل کر دیئے گئے بعض جگہ تو اس محدث کا نام حذف کیا جا سکا اور بعض جگہ رہ گیا۔ چنانچہ آپ سنن ابن ماجہ میں متعدد حدیثوں کی ابتدا حدثنا ابوعبداللہ سے دیکھیں گے۔ ابتدائے کتاب ہی میں دوسری ہی حدیث حدثنا ابوعبداللہ سے شروع ہوئی ہے۔ پھر ساتویں حدیث پھر آٹھویں حدیث بھی۔ اور یہ صرف ابن ماجہ ہی کی کتاب میں نہیں ہے۔ آپ کو صحیح بخاری میں بھی اس کی مثال ملے گی۔ چنانچہ کتاب العیدین کے گیارہویں باب کی دوسری حدیث ملاحظہ فرمائیے۔ ۱۳۳ مطبوعہ مطبع احمدی میرٹھ۔ لکھتے ہیں "حدثنا محمد" اور بعض نسخوں میں صاف ہے "ثنا محمد البخاری" چنانچہ حاشیہ پر یہ نسخہ بھی چھپا ہوا موجود ہے۔ محشی صاحب اور شارحین میں اکثروں نے تو یہ کہدیا کہ ہاں اس نسخے میں ایسا ہے مگر دوسرے نسخوں میں

"محمد" کا لفظ نہیں ہے۔ امام بخاری کے شیخ عمر بن حفص ہی کے نام سے دوسرے نسخوں میں یہ حدیث شروع ہوئی ہے اور کرمانی نے کہدیا کہ یہاں محمد سے مراد محمد بن یحییٰ الذہلی ہیں۔ مگر جس نسخے میں حدثنا محمد البخاری صاف ہے اس کو محمد بن یحییٰ الذہلی کس طرح قرار دیں گے؟ پھر اسی جلد اول کے ص۵۵ کتاب الصلوٰۃ کے اٹھارہویں باب کے آغاز میں فرماتے ہیں "قال ابو عبداللہ" جس طرح وہاں صرف محمد یا محمد البخاری سے خود امام بخاری کی ذات ہی مراد ہے اسی طرح یہاں اس ابو عبداللہ کنیت سے بھی خود امام بخاری ہی کی ذات مراد ہے جس کا اعتراف شارحین کو بھی کرنا پڑا اگرچہ تاویلات کی کوشش کی ہے مگر رائیگاں۔ خیر ان سب کو جانے دیجئے۔ دوسری جلد کے آخر ص۵۹۶ کو دیکھئے باب حدیث الافک کی تیسری حدیث۔ فرماتے ہیں "حدثنا ابو عبداللہ محمد بن اسمعیل بن ابراھیم بن المغیرۃ الجعفی رحمتہ اللہ علیہ"[1] اس کا جواب محشی اور شارحین کے پاس اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ "دوسرے نسخوں میں اتنی عبارت نہیں ہے" اس کا جواب الجواب یہ ہے کہ دوسرے نسخوں میں سے یاران طریقت نے اس عبارت کو اڑا پھینکا اس لئے دوسرے نسخوں میں اب نہیں ہے اگر تھا۔ مگر یہاں حاشیہ پر کوئی دوسرا نسخہ بنایا نہیں ہے۔ یہاں تو کنیت، نام، کئی پشت تک کی ولدیتیں، پھر نسبت اور آخر میں رحمتہ اللہ علیہ بھی موجود ہے۔ اس کے بعد تو یہ شک نہیں ہو سکتا کہ شاید کوئی اور صاحب ہوں۔ اور اس طرح کی مثالیں اور کتابوں میں بھی ملیں گی تلاش اور جستجو کی ضرورت ہے۔ اور یوں تو بخاری و ابن ماجہ کے سوا صحاح کی باقی چاروں کتابیں مسلم، ترمذی، ابوداؤد، اور نسائی ہر ایک کی ابتدا قال الفلاں کہہ کر اس طرح ہوتی ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا جامع کوئی اور ہے، اصل محدث جن کی طرف یہ کتاب منسوب ہے وہ جامع نہیں ہیں بلکہ اُن سے ان حدیثوں کی یا اس مجموعہ احادیث کی جو روایت کر رہا ہے وہ اس مجموعے کا جامع ہے۔ یا یہی تنہا اس کا راوی ہے اور وہی اس کتاب کا ذمہ دار ہے کہ اس کی نسبت اصل شیخ الحدیث کی طرف صحیح ہے یا غلط۔ مگر اس قال کہنے والے کا نام و نشان مذکور نہیں۔ بعد والوں کے سلسلہ اسناد سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اس قال کے قائل فلاں ہوں گے۔ مگر یہ احتمال استدلال کے لئے کافی نہیں۔

مختصر یہ ہے کہ متن کتاب میں محدث کا خود اپنی ہی ذات سے روایت کرنا اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ یہ روایت اس محدث کی نہیں بلکہ اس کے کسی شاگرد کی ہے، اور جب تک اس کا پورا تعارف نہ ہو اس حدیث کی صحت مشتبہ رہتی ہے۔ اور جہاں پورا مجموعہ کسی غیر متیقن شخص کے ذریعے پہنچا ہو وہاں کا کیا پوچھنا ہے۔ اس لئے پھر میں یہی کہونگا کہ

کرتا ہے ہر خبر پہ تمنا یقین کیوں		ناداں! تو یہ دوست فریب عدو نہ ہو

قاضیٔ اور مدینہ طیبہ میرے ایک محترم بھائی جو بہت ذی علم ہیں، اس مسودے کی تحریر کے وقت حسن اتفاق سے تشریف لے آئے کچھ رسمی باتوں کے بعد میں ان کے لئے چائے ناشتے کے سامان میں لگا اور وہ میرا مسودہ اٹھا کر دیکھنے لگے۔ ابو رافع المدنی القاضی کا حال دیکھکر انھیں بہت تعجب ہوا۔ چائے پینے کے وقت فرمانے لگے کہ ابو رافع ایک تو قاضی تھے یہی ان کے ثقہ ہونے کی ضمانت ہے۔ پھر وہ مدنی ہیں۔ میں اہل مدینہ سے کسی طرح کا سوء ظن رکھنا گناہ سمجھتا ہوں، چہ جائیکہ ان کو کاذب و متروک الحدیث وغیرہ سمجھوں۔ آپ تو ان کے

---

[1] رحمتہ اللہ علیہ عجمیوں کی زبان ہے۔ اہل عرب رحمۃ اللہ کہتے ہیں۔ رحمۃ صحیح اور فصیح ہے رحم علیہ عجمی ایجاد ہے۔ رحمۃ اللہ وبرکاتہ علیکم اہل البیت میں برکات کی وجہ سے علیٰ آیا ہے۔ نہ رحمتہ کی وجہ سے صرف رحمۃ اللہ علیہ عرب عرباء کی زبان نہیں ۱۲ تمنا عفی عنہ۔

متعلق عجیب عجیب باتیں لکھ گئے ہیں، جس کے دیکھنے سے میرا ایمان لرز اٹھا۔

میں نے مدینہ طیبہ کے ساتھ ان کا یہ شغف دیکھکر کہا کہ حبك الشیئ یعمی ویصم کسی چیز کی محبت انسان کو اندھا بہرا بنا دیتی ہے، یہ مثل مشہور ضرور ہے مگر دین میں ایسے شغف کو حرام قرار دیا گیا ہے قل یا اھل الکتاب لا تغلوا فی دینکم کہدو اے رسول! کہ اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو۔ (مائدہ ۱۰) دین میں غلو کرنے سے اہل کتاب کو منع کیا جائے اور مسلمانوں کو اس کیلئے اجازت دی جائے، کیا یہ ممکن ہے؟

میں نے ابورافع مدنی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں ایک حرف بھی اپنی طرف سے نہیں لکھا ہے ۲۴ بڑے بڑے ائمہ رجال وحدیث کے اقوال نقل کر دیئے ہیں، آپ کو جو کچھ کہنا ہے ان ۲۴ بڑے بڑے ائمہ رجال وحدیث کو کہئے اور پھر امام ذہبی اور ابن حجر کو کہئے جنھوں نے ان اقوال کو جمع کر دیا۔ میں نے تو صرف ابن حجر کی کتاب کا ترجمہ کر دیا ہے حوالہ جلد وصفحہ ونام کتاب کے ساتھ۔

آپ انھیں ایک مدنی کا حال پڑھکر خفا ہیں۔ تہذیب التہذیب ج ۹ ص۳۶۶ ترجمہ واقدی میں ابن حجر لکھتے ہیں: حکی ابو العرب عن الشافعی قال کان بالمدینة سبع رجال یضعون الاسانید احدھم الواقدی یعنی ابو العرب امام شافعیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ مدینے میں سات آدمی تھے جو حدیثوں کی سندیں گھڑا کرتے تھے۔ ان میں ایک واقدی تھے اور اس سے پہلے ص۳۶۶ میں ہے کہ امام نسائی نے اپنی کتاب الضعفاء میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلعم پر جھوٹ لگانے والے مشہور کذاب چار تھے مدینہ میں واقدی، خراسان میں مقاتل، شام میں محمد بن سعید المصلوب (جس کو سولی دی گئی) مگر چوتھے کا ذکر یہاں نہیں کیا۔ لیکن ج ۱۰ ص۲۸۱ ترجمہ مقاتل میں اس چوتھے کا نام لکھ دیا ہے۔ ابراہیم بن ابی یحیٰی جو مکی تھے۔ مگر ج ۹ ص۱۸۵ ترجمہ محمد بن سعید المصلوب میں لکھا ہے۔ محمد بن سعید المصلوب شام میں مقاتل خراسان میں، واقدی بغداد میں اور ابراہیم بن ابی یحیٰی مدینہ میں۔ لیکن ابراہیم بن ابی یحیٰی جن کو ابن ابی حیہ بھی کہتے ہیں ان کے ترجمے میں ان کو لسان المیزان ج ا ص۱۲۴ اور اس سے پہلے ص۵۲ میں ان کو مکی لکھا ہے، اور ان کی اقامت مدینہ کا کوئی ذکر کہیں نہیں ملتا معلوم ہوتا ہے کہ سبقت قلم سے مکہ کی جگہ مدینہ لکھ گئے۔ باقی رہا واقدی کو ایک جگہ مدینے کی طرف منسوب کیا ہے دوسری جگہ بغداد کی طرف۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سنہ ۱۸۰ھ میں مدینے سے بغداد چلے گئے تھے۔ ان کی وفات سنہ ۲۰۷ھ کی ہے۔ خلیفہ مامون نے ان کو بغداد کا قاضی بنا دیا تھا اور مرتے دم تک یہ بغداد کے قاضی رہے۔ دیکھئے واقدی جیسے مشہور کذاب پہلے مدنی اور پھر قاضی اور دارالخلافہ کے قاضی۔ تہذیب التہذیب ج ۹ میں ص۳۶۳ سے ص۳۶۹ تک ان کی مدح وقدح سب پڑھ جیئے۔ اور بغداد بھی تو کذابوں کا ایک مرکز تھا چنانچہ ابن حجر تہذیب التہذیب ج ا ص۲۵۶ میں لکھتے ہیں کہ کان ببغداد قوم یضعون الحدیث منھم اسحٰق بن نجیح الملطی (ملطیہ روم کا شہر تھا) یعنی بغداد میں ایک قوم ہی ایسی تھی جو حدیثیں گھڑا کرتی تھی، انھیں میں سے ایک اسحٰق بن نجیح الملطی تھے۔

غرض ان وضاعین وکذابین نے مکہ مدینہ کسی مقدس سے مقدس شہر کو بھی نہیں چھوڑا۔ مکہ ومدینہ کا احترام اپنی جگہ پر ہے۔ ان وضاعین وکذابین کے وجود سے مکہ ومدینہ کے احترام میں کوئی فرق نہیں آتا۔

باقی رہا قاضی ہونا، تو کسی کے معتبر ومستند ہونے کی ضمانت نہیں۔ ابھی آپ نے واقدی جیسے مشہور کذاب کے متعلق سنا کہ وہ مدنی بھی تھے اور قاضی بھی تھے اور تا دم مرگ قاضی رہے مگر کذاب اور مشہور ومعروف کذاب بھی تھے۔

اصل یہ ہے کہ کتنے اہل تقویٰ نے منصب قضا قبول نہ کیا، جن میں سے کتنوں کے نام مشہور ومعروف ہیں اور کتنوں کا ذکر متعلقہ کتابوں

ہیں آجتک موجود ہے۔ تو جب مستحقین نے اس منصب سے انکار کیا تو لامحالہ غیر مستحقین نے ان کی جگہ لے لی۔ اگر آپ دیکھیں گے تو قاضیوں کی جماعت میں دوسری ہی صدی سے غیر مستحقین کی تعداد کافی نظر آئے گی۔ مثال کے طور پر میں اپنی کتاب "الرواۃ من القضاۃ" کے مسودے سے دوسری ہی صدی کے قضاۃ میں سے کچھ نام اور ان پر ائمہ رجال کی جرحوں کا خلاصہ بخیال اختصار یہاں پیش کئے دیتا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ کیسے کیسے لوگ اس منصب اہم پر فائز تھے۔ خصوصاً جب کہ ان میں تابعین یا اتباع تابعین ہی تھے۔ ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔

دوسری صدی ہجری کے قضاۃ

(۱) ابراہیم بن بیطار قاضی خوارزم، ضعیف، منکر الحدیث راوی المکذوبات مات قبل سنہ ۲۰۰ھ۔ (۲) ابراہیم بن عثمان ابوشیبۃ الکوفی قاضی واسط۔ کذبہ شعبہ۔ ضعیف۔ لیس بثقۃ متروک الحدیث۔ مات سنہ ۱۶۹ھ۔

(۳) اسد بن عمرو بن عامر ابوالمنذر قاضی واسط۔ لیس بثقۃ۔ لیس بشئ۔ کذوب لا یحل الاخذ عنہ مات سنہ ۱۹۰ھ۔ (۴) حارث بن عبیدہ قاضی حمص۔ ضعیف لیس بقوی مات سنہ ۱۸۶ھ۔ (۵) حفص بن عمر قاضی حلب ضعیف، منکر الحدیث، یروی عن الثقات الموضوعات۔ لا یحل الاحتجاج بہ مات سنہ [illegible]ھ۔ (۶) حکم بن عبداللہ قاضی بلخ کان مرجیا کذابا یضع الحدیث مات سنہ ۱۹۹ھ (۷) شہر بن حوشب قاضی شام تابعی تھے۔ متعدد صحابہ اور بعض امہات المومنین رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایت کرتے تھے۔ بیت المال سے دراہم سے بھری ایک تھیلی چرالی تھی جس پر ایک شاعر نے کہا تھا

لقد باع شہر دینہ بخریطۃ　　　فمن یامن القراء بعدک یا شہر

یعنی شہر نے ایک تھیلی پر اپنا دین بیچ ڈالا تو اب اے شہر! تمہارے بعد کون حفاظ قرآن پر بھروسا کرے گا؟ عباد بن منصور کے ساتھ یہ سفر حج میں تھے تو ان کا عیبہ (سوٹ کیس) چرالیا تھا۔ روایت میں اکثر ثقہ لوگوں سے الٹ پلٹ کر حدیثیں روایت کیا کرتے تھے۔ غرض لا یحتج بہ کے پورے مصداق تھے۔ (۸) عبداللہ بن الحسین قاضی سجستان منکر الحدیث تھے۔ رجعت کا عقیدہ رکھتے تھے جو شیعوں کا مشہور عقیدہ ہے غیر ثقہ تھے مات قبل سنہ ۲۰۰ھ۔ (۹) عمرو بن الازہر العتکی قاضی جرجان۔ لیس بشئ۔ غیر ثقہ متروک الحدیث۔ کان کذابا۔ مات سنہ [illegible]ھ۔ (۱۰) عمرو بن حمید قاضی دینور۔ کان یضع الحدیث۔ مات سنہ [illegible]ھ۔ (۱۱) محارب بن دثار قاضی کوفہ کوفی تابعی۔ لوگوں نے توثیق تو کی ہے مگر یہ بھی اقرار کیا ہے کہ یہ مدلس تھے۔ مرجیہ تھے ان کے پاس ایسی حدیثیں تھیں جن سے لوگ احتجاج نہیں کرتے تھے یعنی سند نہیں سمجھتے تھے مات سنہ ۱۱۶ھ اور بعضوں نے سنہ ۱۲۳ھ لکھا ہے۔ (۱۲) سعید بن عمرو بن اشوع الہمدانی الکوفی۔ قاضی کوفی۔ بدمذہب تھے اور تشیع میں غلو رکھتے تھے۔ مات سنہ [illegible]ھ۔ (۱۳) محمد بن عبداللہ بن علاثہ الحرانی یہ منصور و مہدی دونوں خلیفوں کے قاضی مشہور تھے۔ موضوع حدیثیں روایت کرتے تھے۔ ان سے احتجاج جائز نہیں۔ مات سنہ ۱۶۸ھ۔ (۱۴) یحیی بن سعید التیمی المدنی قاضی شیراز۔ ثقہ لوگوں سے موضوع حدیثیں روایت کرتے تھے۔ مات سنہ [illegible]ھ سے پہلے۔ (۱۵) یحیی بن سعید المازنی الاسطری قاضی شیراز موضوعات کے راوی تھے۔ وفات قریب سنہ [illegible]ھ کے۔ (۱۶) یحیی بن سعید بن قیس قاضی مدینہ وحیرہ۔ تابعی تھے اس لئے ثقہ تھے مگر مدلس تھے سنہ [illegible]ھ یا سنہ [illegible]ھ میں وفات پائی۔ (۱۷) یحیی بن یعقوب ابوطالب قاضی کوفہ منکر الحدیث تھے سنہ [illegible]ھ سے پہلے وفات پائی۔ (۱۸) یوسف بن بحر قاضی حمص۔ ثقہ لوگوں سے منکر حدیثیں روایت کیا کرتے تھے جن کی کوئی دوسرا متابعت نہیں کرتا تھا مات سنہ [illegible]ھ۔ میں نے ان قاضیوں کے نام قصداً یہاں نقل نہیں کئے ہیں جو کسی فرقے کے بہت بڑے امام ہیں یا محدثین میں جن کا پایہ بہت بلند ہے باوجود اس کے ان پر بھی ائمہ رجال کی جرحیں ان مذکورین سے کسی طرح کم نہیں ہیں بلکہ کتنوں سے زیادہ ہیں۔

اسی طرح تیسری صدی میں بھی آپ دیکھیں تو ایسے کتنے مجروح قاضی و مفتی ملیں گے۔ مثلاً داؤد بن ابراہیم قاضی قزوین متروک الحدیث کان یکذب۔ مات بعد ۲۰۰ھ۔ سفیان[12] بن عامر قاضی بخارا لیس بالقوی ترکوہ مات ۲۱۲ھ۔ سلام[13] بن رزین قاضی انطاکیہ غیر معروف تھے ان کی حدیثیں باطل ہیں۔ شعیب[14] بن اسمٰعیل قاضی بغداد۔ اہل سنت سے بغض اور علانیہ جہمیہ مذہب رکھتے تھے۔ مات ۲۲۲ھ۔ عبداللہ[15] بن بحیر الصنعانی عجیب و غریب حدیثیں روایت کیا کرتے تھے۔ ان سے احتجاج جائز نہیں۔ مات قبل ۳۰۰ھ۔ عبداللہ[16] بن محمد بن جعفر ابوالقاسم قاضی قزوین مشہور کتب حدیث میں من گھڑت حدیثیں داخل کیں اور ذلیل و رسوا ہوئے منکر الحدیث تھے مگر قاضی رہے ۳۱۵ھ میں وفات پائی۔ ان کے جنازے میں محدثین نے شرکت نہیں کی۔ یہ اسنادیں شیوخ کے نام بھی بدل دیا کرتے تھے۔ محمد[17] بن موسیٰ ابو غزیہ قاضی مدینہ ثقہ لوگوں سے موضوع حدیثیں روایت کرتے تھے خود بھی حدیثیں گھڑتے تھے۔ مات ۲۰۷ھ۔ وہب[18] بن وہب بن کثیر قاضی بغداد۔ پھر قاضی مدینہ بھی رہے اور والی و امام بھی۔ کذاب تھے بعض محدثین نے کہا کہ قیامت کے دن یہ دجال کی حیثیت میں اٹھائے جائیں گے۔ حدیثیں گھڑا کرتے تھے۔ یہ قاضی القضاۃ بھی بنائے گئے تھے ان کی وفات ۲۰۰ھ کے بعد یا کچھ قبل ہوئی۔ احمد[19] بن ابی داؤد خلیفہ معتصم و خلیفہ واثق کے خاص مقرب تھے ہوئے بصرہ کے قاضی تھے۔ جہمیہ مذہب میں غلو اور اہل سنت سے سخت بغض رکھتے تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے ان پر کفر کا فتویٰ دیا تھا۔ ان کے بعض شعروں سے بھی ملحدانہ خیالات کا ظہور ہوتا ہے۔ مات ۲۴۰ھ۔ اسمٰعیل[20] بن زیاد قاضی موصل۔ ان کو ابن ابی زیاد بھی کہتے ہیں۔ منکر الحدیث تھے۔ ابن حجر لکھتے ہیں دجالؒ۔ ان کا ذکر ہی کتابوں میں جائز نہیں مگر یہ کہ ان پر قدح و جرح کی جائے۔ کذاب تھے۔ حدیثیں گھڑا کرتے تھے۔ مات ۲۴۲ھ۔ یحییٰ[21] بن اکثم بن محمد بن قطن۔ کذاب تھے۔ دجال تھے۔ ثقہ لوگوں سے عجیب عجیب حدیثیں روایت کیا کرتے تھے جن کی متابعت نہیں مل سکتی۔ کسی مسئلہ پر بولتے وقت کوئی خوشرو چھوکرا ان کے سامنے جا ن آگیا اور ان کی نظر پڑگئی تو ان کی گفتگو خبط ربط ہو جاتی تھی۔ ایک بار سلیمان بن حرب مصری سے انہوں نے کہا کہ بعض مشائخ مصر حمص[؟] فی حدیثیں روایت کیا کرتے ہیں تو سلیمان بن حرب نے کہا کہ بعض قاضی ایسا فعل کیا کرتے ہیں جس فعل پر اللہ نے ایک قوم پر عذاب نازل کیا تھا تو سر جھکا کر چپ ہو رہے۔ ۲۴۳ھ میں وفات پائی۔ ان ناموں کے علاوہ بھی نام ہیں طوالت کے خوف سے ترک کرتا ہوں۔

اسی طرح چوتھی صدی میں بھی اس قسم کے بہت سے قاضی گذرے ہیں۔ مثلاً عبداللہ[22] بن احمد بن راشد جن کو "ابن اخت ولید" لوگ کہتے تھے۔ دمشق کے قاضی تھے۔ اکثر رشوت لیکر فیصلے کیا کرتے تھے۔ بغدادی تھے۔ مات ۳۶۹ھ۔ خلف[23] بن یحییٰ الخراسانی قاضی رے۔ ابو حاتم نے ان کو کاذب قرار دیا ہے ۳۰۰ھ سے پہلے وفات پائی۔ عبداللہ[24] بن احمد بن ربیعہ یہ بھی قاضی تھے۔ ان کو غیر ثقہ۔ کذاب لکھا ہے ۳۲۹ھ میں وفات پائی۔ عبداللہ[25] بن معاویہ قاضی عسقلان۔ لیس بشئی۔ یہ حدیث میں کچھ بھی نہ تھے ان سے احتجاج جائز نہیں۔ مات فی حدود ۳۳۰ھ۔ عبدالرحمٰن[26] بن محمد بن علویہ الابہری قاضی طوس۔ متون احادیث پر نئی نئی شخصیتوں کے نام چڑھایا کرتے تھے۔ غیر ثقہ راوی کی جگہ ثقہ راویوں کے نام رکھ دیا کرتے تھے اور موضوع حدیثیں روایت کرتے تھے۔ حاکم نے ان کی متعدد حدیثیں لکھ کر لکھا کہ یہ سب موضوع ہیں اور انھیں کی من گھڑت ہیں یہ کذاب تھے ۳۲۲ھ میں وفات پائی۔ علی[27] بن محمد بن ابی الفہم ابوالقاسم التنوخی قاضی اہواز ادیب تھے۔ شاعر تھے۔ نجومی تھے اور شراب کے مدام تھے۔ کبھی اس سے پرہیز کی طرف مائل نہ ہوئے۔ ۳۴۲ھ میں وفات پائی۔ محمد[28] بن الحسن بن علی الاشنانی القاضی۔ دارقطنی نے ان کو

ضعیف وکاذب قرار دیا ہے۔ ابن حجر لکھتے ہیں کہ بہت سی بلائیں ان کے ساتھ ہیں اور یہ کاذب غیر ثقہ تھے۔ ۳۳۷ھ میں وفات پائی۔ محمد بن بدر القاضی۔ مصر کے قاضی تھے اور رشوت لیا کرتے تھے جب رشوت دینے والے کے موافق فیصلہ دیا کرتے تھے۔ مات ۳۳۰ھ۔ ابوبکر محمد بن عمر بن محمد التمیمی قاضی موصل۔ شیعہ تھے۔ اور ابن العمید کی مجلس میں اس کے ساتھ شراب پیا کرتے تھے۔ ۳۵۰ھ سے پہلے ان کی وفات ہے۔ محمد بن العثمان بن الحسن النصیبی قاضی کرخ۔ شیعہ تھے۔ کذاب تھے، شیعوں کے موافق منکر حدیثیں روایت کیا کرتے تھے اور خود بھی حدیثیں گھڑتے تھے مات بعد ۳۵۰ھ۔ بکر بن عبداللہ بن محمد القاضی۔ منکر الحدیث تھے۔ حاکم نے ان کی وہ حدیثیں جنھیں انھوں نے نیشاپور میں روایت کیا تھا تمثیلاً اس لئے نقل کی ہیں تاکہ اہل علم سمجھ لیں کہ یہ حدیثیں من گھڑت ہیں۔ ۳۵۰ھ سے کچھ پہلے یا بعد کو وفات پائی۔ ان کے علاوہ بھی چوتھی صدی میں کچھ قاضی اس قسم کے گذرے ہیں۔

اب لیجئے پانچویں صدی کے بھی چند قاضیوں کا حال سن لیجئے۔ سعد بن علی القاضی ابوالوفاء۔ راوی صحیح بخاری۔ یعنی ایک شخص کے واسطے سے یہ فربری سے صحیح بخاری کی روایت کرتے تھے مگر متہم بکذب تھے۔ ایک عجیب قیامت تو انھوں نے یہ کی کہ حضرت علیؓ سے بلا واسطہ حدیث سننے کے مدعی تھے۔ بعضوں نے ان کا نام مبہم رکھا ہے اور ان کا نام محمد بن احمد بن علیجہ ظاہر کیا ہے۔ ۴۰۴ھ میں وفات پائی۔ عبدالجبار بن احمد الہمدانی قاضی رے۔ بہت بدنام تھے منصب قضا کے ذریعے اس قدر مال حاصل کیا کہ قارون وقت سمجھے جاتے تھے۔ بدباطن اور خبیث العقیدہ تھے۔ مات ۴۱۵ھ۔ محمد بن احمد بن حامد قاضی حلب۔ عبدالوہاب الانماطی نے ان کو کذاب لکھا ہے۔ معتزلی تھے۔ اور لوگوں کو اعتزال کی طرف دعوت دیا کرتے تھے۔ محمد بن علی بن ودعان ابوالنصر۔ قاضی موصل۔ کذاب تھے۔ مات ۴۹۴ھ۔ ہیثم بن محمد بن طاہر قاضی طبرستان۔ ان کا دعویٰ تھا کہ یہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں پیدا ہوئے تھے اور اپنے باپ کے ساتھ حضرت علیؓ کی لڑائیوں میں ان کی طرف سے شریک ہوئے اور ۴۶۰ھ تک زندہ رہے۔ عجیب و غریب حدیثیں روایت کیا کرتے تھے۔ احمد بن محمد بن احمد قاضی بسطام۔ خطیب نے کہا کہ یہ بعض مکروہ باتوں میں مبتلا تھے۔ ابن حجر لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ سے ایک باطل حدیث بھی روایت کرتے تھے۔ مات قبل ۴۸۰ھ۔ عبدالرحیم بن محمد بن الحسن بن عبداللہ القاضی غیر ثقہ تھے۔ بعض رذیل خصلتیں ان میں تھیں ۴۴۰ھ سے پہلے وفات پائی اور ان کا سال وفات ۴۴۶ھ بھی لکھا ہے۔ محمود بن محمد القاضی۔ ایک موضوع حدیث، ایک خود ساختہ جن صحابی سے روایت کرتے تھے اور کہتے تھے حدثنا عبدالنور الجنی الصحابی ۴۶۰ھ سے کچھ پہلے یا بعد کو وفات پائی۔ محمد بن احمد بن حامد بن عبید ابوجعفر قاضی بخارا۔ غیر ثقہ۔ لایحتج بہ تھے۔ مات ۴۸۳ھ۔ محمد بن علی القاضی ابوالعلاء قاضی واسط۔ مسلسل باخذ اللحیۃ کی حدیث انھیں کی من گھڑت ہے۔ خطیب نے اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کے اصول مضطرب تھے۔ ان کی کتاب میں متعدد جگہ محو و اثبات کے نشانات تھے۔ اسناد میں ردوبدل کیا کرتے تھے اور بھی بعض باتیں خطیب نے لکھی ہیں جو ان کو سبک اور ہلکا ثابت کرتی ہیں۔

میں دوسری صدی سے لے کر آٹھویں صدی تک کے متعدد نام مذکورہ اسماء کے علاوہ پیش کر سکتا ہوں جو ضعیف الحدیث منکر الحدیث یا وضاع و کذاب وغیرہ تھے۔ یا جو رشوت یا دوسرے خصائل ذمیمہ میں مبتلا تھے مگر مقصود اسلاف کی معائب چینی یا ان کی توہین و تذلیل نہیں ہے۔ معاذ اللہ من ذلک۔ میرا مقصد یہ ہے کہ صرف کسی کے اہل مدینہ یا اہل مکہ ہونے سے یا کسی کے قاضی و مفتی ہونے سے اس کو ثقہ و حجت نہ سمجھ لیا جائے۔ ھم رجال و نحن رجال وہ بھی آدمی ہی تھے ہم لوگ بھی آدمی ہی ہیں۔ اصل سند و حجت صرف

قرآنِ مبین ہے۔ حدیثیں جو ہمارے پاس چند راویوں کے ذریعے پہنچتی ہیں، اور یہ معلوم ہے کہ راویوں میں وضاعین وکذابین کی ایک بڑی جماعت تھی اور منافقین وملاحدہ کی ایک زبردست سازش ان روایتوں کی ٹٹی کے پیچھے بیٹھکر اسلام کے خلاف صدیوں تک اپنا کام کرتی رہی اور طرح طرح کے محاذ سے اسلام و قرآن پر جھوٹی جھوٹی حدیثوں کی گولہ باری کرتی رہی۔ اس لئے جب کوئی حدیث ہمارے سامنے آئے تو ہمارا فرض ہے کہ اذا جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا۔ جب کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی کرید کرو، تحقیق کرو کہ یہ خبر صحیح ہے یا غلط (حجرات ع۱) اس حکم قرآنی کے مطابق ہمیں ہر حدیث کے متعلق تحقیق کرنی چاہئے جس کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا طریقہ یہی اور صرف یہی ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ یہ حدیث قرآن مبین کے خلاف تو نہیں ہے؟ اگر قرآن مبین کے خلاف ہو تو فوراً اس کو رد کر دیں کہ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے اور پھر درایت کا بھی تقاضا یہی ہے اور ایمان و دیانت کا مقتضا بھی یہی ہے اور اگر قرآن کے مطابق ہو تو اس کے رجال کو دیکھیں اگر رجالِ اسناد ثقہ ہیں تو اس حدیث کو صحیح سمجھیں۔ رجال غیر ثقہ یا ضعیف بھی ہوں تو سمجھیں کہ ممکن ہے کہ یہ حدیث صحیح ہی ہو کیونکہ قرآن مجید کے بالکل مطابق ہے۔ اور غیر ثقہ یا کذاب شخص بھی کبھی سچی بات بول دیتا ہے۔

آخر میں عرض ہے کہ قاضیوں کے متعلق میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی کی کتابیں تہذیب التہذیب، لسان المیزان سے اور امام ذہبی کی کتابیں تذکرۃ الحفاظ اور میزان الاعتدال سے ماخوذ ہے جس کا جی چاہے ملا کر دیکھ لے۔ اسی طرح حدیثوں کے رجال کی تنقید میں بھی میرا اصل ماخذ یہی چاروں کتابیں ہیں۔ بعض مضامین تقریب یا طبقات ابن سعد سے بھی ماخوذ ہو سکتے ہیں۔ جہانتک مجھے یاد ہے میں نے حوالے کہیں بھی چھوڑے نہیں ہیں۔

میں نے ان حدیثوں کی تنقید صرف روایت پرستوں کے لئے لکھی ہے کہ تا بدر باید رسانید۔ ورنہ جو لوگ قرآن مجید کو کامل و مکمل سمجھتے ہیں اور ما فرطنا فی الکتٰب من شئ اور نزلنا علیک الکتٰب تبیانا لکل شئ پر ایمان کامل رکھتے ہیں ان کو ان تنقیدات کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ ان کیلئے تو ان ساری حدیثوں کے غلط ہونے کی صرف یہی ایک زبردست دلیل کافی ہے کہ نزول مسیح بن مریمؑ کا کوئی ذکر قرآن مبین میں نہیں ہے اسلئے نزول مسیح کا عقیدہ ہی باطل ہے اور یہ ساری حدیثیں یقیناً جھوٹی ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو روایت پرستی کے مرض سے نجات دے اور قرآنی ہدایت سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دے۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب وصلی اللہ علی سیدنا ونبینا محمد وآلہ وصحبہ وخیار امتہ وبارک وسلم واٰخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

تمنا عمادی پاکستانی غفرلہ

قرآنی دستور پاکستان

آئینی جدوجہد کے سلسلے میں ادارہ طلوع اسلام کی پیشکش۔ قرآن کی روشنی میں مسودات قرارداد مقاصد و بنیادی اصول و حقوق جو حکومت کے اعلان کے جواب میں بھیجے گئے بنائے ہی حکومت کی جانب سے پاس کردہ قرارداد مقاصد اور بنیادی اصولوں کی پہلی رپورٹ پر قرآن کی روشنی میں تنقید۔ مولوی صاحبان کے بائیس نکات کا تجزیہ اسلامی جماعت کی دستوری سفارشات پر تبصرہ۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات مجلد مع گرد پوش۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ (علاوہ محصول ڈاک۔)

مقامِ حدیث

ایک مسلمان کے لئے بنیادی سوال ہے کہ دین کسے کہتے ہیں۔ عام طور پر اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ دین، کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ صلعم کے اندر ہے۔ یعنی قرآن اور حدیث دونوں مل کر دین کی تکمیل کرتے ہیں۔ حدیثوں کے بغیر نہ قرآن سمجھا جا سکتا ہے نہ اس کے احکام پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے احکام مجمل ہیں۔

طلوع اسلام میں اس مسلک پر شروع سے لکھا جاتا رہا ہے۔ دین میں حدیث کا صحیح مقام کیا ہے؟ کیا رسول اللہ صلعم نے حدیثوں کا کوئی مستند مجموعہ امت کو دیا تھا؟ کیا خلفائے راشدین نے کوئی ایسا مجموعہ مرتب کیا تھا؟ اگر نہیں کیا تھا تو کیوں نہیں کیا؟ حدیثیں کب مرتب ہوئیں؟ کس کس نے مرتب کیں؟ ہم تک کیسے پہنچیں؟ ان کے اندر کیا کچھ ہے؟ ان کی رو سے دین کی کیا شکل بنتی ہے؟ اس قسم کے سینکڑوں مباحث تھے جن پر تفصیلی طور پر لکھا گیا اور معترضین کے اعتراضات کا جواب دیا گیا۔ یہ معلومات کا بیش بہا ذخیرہ طلوع اسلام کے ہزارہا صفحات میں بکھرا پڑا تھا ضرورت کا تقاضا تھا کہ ان تمام مباحث کو یکجا کر دیا جائے۔ یہ مجموعہ چار چار سو سے زیادہ صفحات کی دو جلدوں میں آیا ہے۔

"مقامِ حدیث" جلد اول اور جلد دوم، دونوں

تیار ہیں۔ علاوہ محصول ڈاک قیمت جلد اول چار روپے۔ جلد دوم چار روپے۔ جلد منگائیے۔

معاونین حضرات

کو آرڈر بھیجنے کی ضرورت نہیں، ان سب کی خدمت میں کتاب از خود بھیجدی جائے گی۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام، کوی روڈ۔ (صدر) کراچی

باب المراسلات

(۱) پنجاب کی تحقیقاتی کمیٹی پچھلے دنوں ہمارے پاس متعدد خطوط اس موضوع پر پہنچے کہ فسادات پنجاب کی تحقیقاتی عدالت نے جو دس نکات پر مشتمل سوالنامہ شائع کیا ہے۔ طلوع اسلام کی طرف سے ان کا جواب عدالت مذکور کے پاس بھیجا جائے تاکہ سوالات متعلقہ کے بارہ میں عدالت کے سامنے قرآنی نقطۂ نظر بھی آجائے۔ ہم قارئین طلوع اسلام کے اس تقاضہ سے متفق ہیں اور اس مسئلہ کی اہمیت سے بھی ہمیں انکار نہیں۔ لیکن انھوں نے اس سوالنامہ کی نوعیت کو صحیح سمجھا نہیں۔ عدالت مذکور نے مختلف جماعتوں کو یا عوام کو دعوت نہیں دی کہ وہ ان کے جوابات عدالتِ مذکور کو بھیجیں۔ اس عدالت نے صرف یہ اعلان کیا ہے کہ وہ جماعتیں جنھیں اس عدالت نے "مقدمہ" زیرِ نظر میں پارٹیز (PARTIES) قرار دیا ہے وہ جب عدالت کے سامنے آئیں تو ان سوالات کا جواب دینے کے لئے تیار ہو کر آئیں۔ لہٰذا یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ کوئی فرد یا ادارہ ان سوالات کے جوابات عدالتِ موصوف کے پاس بھیجے۔ البتہ اگر عدالتِ موصوف چاہے تو طلوع اسلام کی طرف سے ان تمام سوالات کے جواب جو عدالتِ موصوف نے آج تک اسلام اور احمدیت کے متعلق مختلف حضرات سے پوچھے ہیں تحریری بیان کی صورت میں عدالت کی خدمت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اس مقصد کے ماتحت کہ عدالت کے سامنے یہ حقیقت آجائے کہ ان سوالات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔

بعض احباب نے ہمیں یہ بھی لکھا ہے کہ اگر ہم ان سوالات کے جوابات عدالت کے پاس نہیں بھیج سکتے تو ان سوالات کو قارئین طلوع اسلام کے سوالات سمجھ لیا جائے اور ان کی اطلاع کے لئے طلوع اسلام میں لکھا جائے کہ قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔ ان حضرات کا یہ تقاضہ معقول ہے لہٰذا ہم ان کی اطلاع کی خاطر صرف ان سوالات کے متعلق قرآنی نقطۂ نگاہ مختصر الفاظ میں عرض کرتے ہیں جن کا تعلق فسادات یا ان کے تضمنات سے نہیں بلکہ دین اور اس کے متعلقات سے ہے۔

پہلا سوال:۔ ظہورِ مسیح اور مہدی۔

جواب:۔ قرآن کریم میں نہ کسی مسیح کے آنے کا ذکر ہے اور نہ مہدی کا۔ کسی آنے والے کا یہ تصور ہی غیر قرآنی ہے۔

دوسرا سوال: کیا مسیح موعود عیسیٰ ابن مریمؑ ہی ہوں گے یا کوئی اور؟

جواب:۔ جب قرآن میں کسی مسیح کے آنے کا وعدہ ہی نہیں کیا گیا تو یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ

آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہے؟
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات۔ (اقبال)

مسیح اور مہدی تو ایک طرف قرآن میں کسی مجدد کا بھی ذکر نہیں۔

تیسرا سوال: کیا مسیح اور مہدی نبی ہوں گے اور ان کی طرف وحی یا الہام ہوگا؟

جواب: پہلے اور دوسرے سوال کے جوابات کی روشنی میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آنیوالے مسیح یا مہدی نبی ہوں گے یا نہیں۔ ویسے بھی ختم نبوت کے بعد کسی کے نبی ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اور وحی چونکہ صرف انبیاء کو ملا کرتی ہے اس لئے رسول اللہؐ کے بعد کسی کو وحی ملنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ (قرآن میں جو شہد کی مکھی کی طرف وحی، یا آسمانوں کی طرف وحی، یا ام موسیٰ اور حضرت مسیحؑ کے حواریوں کی طرف وحی کا لفظ آیا ہے، اس سے مقصود وہ وحی نہیں جو ایک نبی کو ملتی ہے۔ اور جو دین کا ضابطہ بنتی ہے)۔

باقی رہا الہام سو اس کا ذکر بھی قرآن میں کہیں نہیں کہ خدا کی طرف سے کسی شخص کو الہام ہوا کرتا ہے۔ سارے قرآن میں الہام کا لفظ صرف ایک جگہ آیا ہے جہاں نفس انسانی کے متعلق لکھا ہے کہ والھمھا فجورھا وتقوٰھا (۹۱/۸) جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے نفس انسانی میں "فجور" اور "تقویٰ" کی خاصیتیں رکھدی ہیں کسی خاص فرد کو خدا کی طرف سے الہام ملنے کا ذکر کہیں نہیں۔

چوتھا سوال: کیا مسیح یا مہدی قرآن یا سنت کے کسی قانون کو منسوخ کریں گے؟

جواب: جب قرآن کی رو سے کسی مسیح یا مہدی نے آنا ہی نہیں تو پھر یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن کے احکام خدا نے مکمل کر دیئے ہیں اور کوئی انھیں منسوخ نہیں کر سکتا حتیٰ کہ خود رسول اللہ صلعم کو بھی اس کا اختیار نہیں تھا۔ آپ خود بھی وحی کی اتباع کرتے تھے۔ وحی کو منسوخ نہیں کر سکتے تھے۔

باقی رہے سنت کے احکام تو رسول اللہؐ نے اس قسم کے احکام کا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا۔ آپ نے امت کو صرف قرآن دیا تھا۔

پانچواں سوال: رسول اللہؐ کی طرف وحی کس طرح نازل ہوتی تھی اور کیا حضرت جبرئیلؑ رسول اللہؐ کے سامنے مرئی شکل میں آیا کرتے تھے؟

جواب: نبی کے علاوہ کوئی انسان وحی کی ماہیت اور کیفیت کو سمجھ نہیں سکتا۔ انسان کے پاس ذریعہ علم اس کی عقل ہے اور وحی عقل کی حد سے باہر کی چیز ہے۔ ہم وحی کی صداقت کو علم اور عقل کی رو سے پہچان سکتے ہیں لیکن یہ نہیں جان سکتے کہ رسول پر وحی ہوتی کس طرح سے تھی۔ لہٰذا کوئی شخص بھی نہیں کہہ سکتا کہ جبرئیل رسول اللہ صلعم کے پاس کس شکل میں آیا کرتے تھے۔ قرآن میں جبرئیل کے متعلق اتنا ہی ہے کہ فانہ نزلہ علی قلبک باذن اللہ (۲/۹۷) "جبرئیل نے اس قرآن کو اللہ کے قانون کے مطابق تیرے قلب پر نازل کیا"۔ سو جو معاملہ نبی کے قلب سے متعلق ہوا سے ہم کس طرح جان سکتے ہیں۔ انسان کے علم کی تو یہ کیفیت ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کے قلب کے ماجریات کو بھی محسوس نہیں کر سکتا۔

چھٹا سوال: کیا ختم نبوت کا وہ مفہوم جسے آل مسلم پارٹیز کنونشن نے پیش کیا تھا ہمیشہ سے اسلامی عقیدہ کا جزو رہا ہے؟

جواب: ہمیں اس کا علم نہیں کہ آل مسلم پارٹیز کنونشن نے ختم نبوت کا کیا مفہوم پیش کیا تھا لیکن قرآن کی رو سے ختم نبوت کا مفہوم اس قدر واضح ہے کہ اس کی مختلف تفسیریں یا تعبیریں ہو نہیں سکتیں۔ قرآن کی رو سے ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ

(۱) خدا نے جو دین (نظامِ حیات) انسانوں کے لئے تجویز کیا تھا وہ قرآن میں مکمل ہو گیا۔

(۲) قرآن کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔

(۳) لہٰذا خدا کی طرف سے اب کسی اور دین بھیجنے کی ضرورت نہیں رہی۔

(۴) اور اسی لئے اب کوئی نبی بھی نہیں آسکتا کیونکہ نبی خدا کی طرف سے دیئے ہوئے دین کو انسانوں تک پہنچانے کیلئے آتا ہے۔ اس کا خدا کی طرف سے دین پانا، نبوت کہلاتا ہے اور اس دین کا دوسروں تک پہنچانا رسالت۔ نبوت کا سلسلہ تکمیل دین کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اب رسالت کا فریضہ (یعنی اس دین کو عملاً متشکل کرنا اور دوسروں تک پہنچانا) امت کا فریضہ قرار پایا جسے خدا نے کتاب کا وارث قرار دیا ہے۔

جو شخص قرآن پر ایمان رکھتا ہے اسے قرآن کی مندرجہ بالا تعلیم پر بھی ایمان رکھنا ہو گا کیونکہ یہ تعلیم دین کے بنیادی اجزاء میں سے ہے۔

ساتواں سوال: (ا) اس نظریہ کی تائید میں قرآن و سنت کی نصوص کہ غیر مسلم، اسلامی نظامِ حکومت کے اجزاء نہیں بن سکتے۔ نیز وہ حدود جس تک انھیں اس نظام سے الگ رکھا جائیگا۔ اس کیلئے تاریخی نظائر بھی پیش کئے جائیں۔

(ب) غیر مسلموں کا یہ حق کہ وہ اپنے مذہب کی عام تبلیغ کر سکتے ہیں۔

(ج) کیا ایک کے گناہوں کا بوجھ کوئی دوسرا اٹھا سکتا ہے؟

جواب: (الف) یہ ایک ایسا موضوع ہے جو بڑی تفصیل کا محتاج ہے لیکن ہم مختصراً یہ عرض کریں گے کہ قرآن انسانوں کی تفریق تصورِ حیات (IDEOLOGY) کی بنا پر کرتا ہے۔ وہ قرآنی تصور کو ماننے والوں کو مومن کہتا ہے اور جو اس تصورِ حیات کو نہیں مانتے انھیں کافر (یعنی نہ ماننے والے) قرار دیتا ہے۔ آپ سارے قرآن میں دیکھئے، وہ مومن اور کافر کی درمیانی خلیج کو مسلسل قائم رکھتا ہے۔ وہ کافر کو وہ تمام حقوق تو دیتا ہے جو ایک انسان ہونے کی جہت سے اسے حاصل ہیں لیکن وہ انھیں اس نظام کی مشینری کا پرزہ نہیں بناتا جو اس تصورِ حیات پر قائم کیا جاتا ہے۔ وہ اس نظام کے نظم و نسق کو "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور اس فریضہ کو وہ جماعت مومنین کے اندر محدود رکھتا ہے۔ [دیکھئے (۳/۱۰۴)] وہ کہتا ہے کہ یہ نظام باہمی مشاورت سے قائم کیا جائے گا اور اس مشاورت کیلئے اس کی شرط یہ ہے کہ یہ صرف مومنین کے اندر ہی رہے۔ (۴۲/۳۸) وہ جب اس نظام کے مرکز (رسول) کو مشورہ کا حکم دیتا ہے تو اس وقت بھی یہی کہتا ہے کہ یہ مشورہ اپنی جماعت سے کیا جائے (۳/۱۵۹) وہ جب اس نظام کے ارباب حل و عقد (اولی الامر) کا ذکر کرتا ہے تو اس کے لئے بھی منکم کی شرط لگاتا ہے۔ یعنی وہ تم میں سے ہونے چاہئیں۔ (۴/۵۹)۔ اس کے برعکس وہ صاف صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ غیر مومنین کو اپنے رازوں میں شریک نہ کرو۔ (۳/۱۱۸) [ظاہر ہے کہ جس شخص کو راز دار نہ بنایا جا سکے اُسے کسی نظام کی مشینری کا پرزہ کیسے بنایا جا سکتا ہے] اور اس کی وجہ وہ یہ قرار دیتا ہے کہ غیر مسلم کبھی تمہارے دلی خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ تم ایک ایسے نظام کو لیکر اٹھے ہو جس کی بنیادوں سے وہ اختلاف رکھتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اس موضوع پر بڑی تفصیل سے لکھا جا سکتا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اصل نکتہ کے سمجھنے کے لئے یہ مختصر سے اشارات بھی کافی ہوں گے۔ باقی رہے تاریخی نظائر تو وہ بھی پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن اس باب میں طلوع اسلام کا مسلک کچھ اور ہے۔ وہ قرآنی حقائق کو حقائق مانتا ہے خواہ ان کی تائید میں ایک تاریخی نظیر بھی نہ مل سکے۔ اور جو چیز قرآنی حقیقت نہیں ہے اسے وہ حقیقت نہیں مانتا خواہ ساری تاریخ اس کی تائید میں بھری پڑی ہو۔ بایں ہمہ اس قدر تو ہر ایک کو تسلیم ہوگا کہ عہد رسالت مآب میں کوئی غیر مسلم اسلامی نظام کے اندر شریک نہیں تھا۔

(ب) غیر مسلموں کو تبلیغ کا حق ۔ غیر مسلموں کو ان کے مذہبی معاملات کی تبلیغ کا حق حاصل ہوگا۔ لیکن اس کا تعین ضروری ہوگا کہ کون کون سے امور ان کے مذہب سے متعلق ہیں۔ ایک اسلامی مملکت میں مسلمان کسے کہا جائے گا، اسے کن کن امور میں آزادی ہوگی۔ وہ کس مقام پر پہنچکر مسلمان نہیں رہے گا۔ یہ وہ سوالات ہیں جن کا تعلق ایک جداگانہ موضوع سے ہے۔

(ج) اس سوال کے انگریزی کے الفاظ یہ ہیں:

VICARIOUS LIABILITY IN SIN

ان الفاظ کا مطلب ہم یہی سمجھ سکے ہیں کہ کیا کوئی شخص کسی دوسرے کے گناہوں کا بوجھ اٹھا سکتا ہے۔ چونکہ اس مسئلہ کا تعلق اس موضوع سے دکھائی نہیں دیتا جس کی بابت یہ سوال نامہ شائع ہوا ہے اس لئے ہمیں شبہ پیدا ہوا کہ شاید اس سے مفہوم کچھ اور ہے۔ لیکن اگر یہی مفہوم ہے تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ اس لئے کہ قرآن میں ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر لکھا ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (۵۳/۳۸) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔ قرآن کی تعلیم کی بنیاد ہی مکافاتِ عمل کے محکم اور غیر متبدل قانون پر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی اپنی ذات پر پڑتا ہے اور یہی اثرات ان اعمال کے نتائج ہیں۔ اسی کا نام جزا اور سزا ہے وہ اعمال جن سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے اعمال صالحہ کہلاتے ہیں اور جو اس کے ضعف و اضمحلال کا باعث بنتے ہیں۔ اعمال سیئہ سے تعبیر کئے جاتے ہیں۔ مکافاتِ عمل کے اس قرآنی تصور کے ماتحت یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ کسی ایک کے گناہوں کا بوجھ کوئی دوسرا اٹھالے۔ سنکھیا میں کھاؤں اور اس کی وجہ سے موت کسی اور کو آجائے۔ یہ قانون مکافات کے خلاف ہے۔

آٹھواں سوال: آٹھویں سوال میں راست اقدام کا جواز پوچھا گیا ہے اور نویں اور دسویں سوال میں ان مطبوعات کی فہرست مانگی گئی ہے جن سے عام مسلمانوں یا احمدیوں کے جذبات مجروح ہوئے ہوں۔ یہ سوالات ہمارے دائرہ سے باہر ہیں۔

جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا ہے، ہم نے یہ جوابات ان قارئین کے استفسارات کے ضمن میں شائع کئے ہیں جو اپنی معلومات کی خاطر قرآنی نقطۂ نظر کی وضاحت چاہتے تھے۔ اور وہی ان کے مخاطب بھی ہیں۔ ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کی قرآنی سندات ہمارے پاس موجود ہیں۔

۲۔ رضاعی بہن بھائی

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ

۱۹۲۷ء میں ایک لڑکا پیدا ہوا جس نے اپنی چچی کا دودھ پیا۔ اس کی چچی کے ہاں قریب دس سال بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ کیا قرآن کی رو سے اس لڑکی کا نکاح اس لڑکے کے ساتھ ہو سکتا ہے؟

جواب: قرآن نے (سورۂ نساء میں) جو محرمات کی فہرست دی ہے اس میں یہ لکھا ہے کہ تم پر حرام ہیں

(۱) امھاتکم التی ارضعنکم — تمہاری وہ مائیں جنھوں نے تمہیں دودھ پلایا۔

(۲) واخواتکم من الرضاعۃ — اور تمہاری دودھ شریک بہنیں۔

یعنی جس عورت کا دودھ کوئی بچہ پیئے وہ اس کیلئے (جہانتک نکاح کا تعلق ہے) بمنزلہ ماں کے ہوجاتی ہے اور جس جس لڑکی نے اس عورت کا دودھ پیا ہو (نکاح کے مقصد کے لئے) اس لڑکے کی بہنوں کے حکم میں آجاتی ہے۔ اس لڑکے کا نکاح اس قسم کی لڑکیوں سے حرام ہے۔ بنا بریں مذکورہ بالا استفسار میں اس لڑکے کا نکاح اس لڑکی سے نہیں ہوسکتا جو دس سال بعد اس عورت کے ہاں پیدا ہوئی جس کا دودھ وہ لڑکا پی چکا تھا۔

۳۔ رہن

رسالپور سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ

رہن کے متعلق قرآنی احکام کیا ہیں۔ مجھے تو یہ سودہی کی ایک صورت نظر آتی ہے۔ ہمارے ہاں رہن رکھکر روپیہ لینے کا عام دستور ہے۔ جب تک مقروض اپنا قرض بے باق نہیں کرتا، قرض دینے والا اس زمین سے استفادہ کرتا رہتا ہے۔

جواب: سورۂ بقرہ آیت ۲۸۳ میں یہ حکم ہے کہ جب تم آپس میں قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔ اس کے بعد آیت کے باقیماندہ حصہ میں پوری تفصیل دی گئی ہے کہ تحریر کی شکل کیا ہوگی، گواہیاں کیسی ہوں گی وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد اگلی آیت میں ہے وان کنتم علی سفر ولم تجدوا کاتبا فرھان مقبوضۃ یعنی اگر تم حالتِ سفر میں ہو اور وہاں لکھنے والا نہ ملے تو پھر تم کوئی چیز بطور ضمانت اپنے قبضہ میں رکھ لیا کرو۔ اس کا نام ہے رہن یا قبضہ۔ یعنی جب کبھی ایسی صورت ہوجائے کہ قرضہ کا معاملہ لکھنے میں نہ آسکے۔ (اس زمانہ کے عرب میں تو ایسی صورتیں اکثر و بیشتر پیش آسکتی تھیں لیکن ہمارے ہاں اب شاذ ہی کوئی ایسی صورت ہوسکتی ہے کہ کوئی شخص کسی کو قرضہ دے اور اس بات کا لکھنے والا نہ ملے۔ لیکن اگر ایسی صورت پیدا ہوجائے) تو قرض لینے والے کی کسی ایسی چیز کو بطور ضمانت رکھ لیا جائے جو اس قرضہ کی رقم کے برابر یا اس سے زیادہ ہو۔ مقصد صرف ضمانت ہے اور اس کی تشریح آیت کے باقی ٹکڑے نے کردی ہے جہاں یہ کہا گیا ہے کہ فان امن بعضکم بعضا۔ اگر تم میں سے ایک دوسرے کا اعتماد کرے فلیؤد الذی اؤتمن امانتہ تو جس شخص پر اعتماد کیا گیا ہے اسے چاہئے کہ قرضہ دینے والے کی امانت (زرِ قرضہ) کو واپس کردے۔ اس سے بات صاف ہوگئی کہ قرض کے معاملہ میں تحریر کی عدم موجودگی میں، قرض لینے والا جو چیز اپنے قبضہ میں لیگا وہ محض ضمانت کے طور پر ہوگی۔ نہ اسلئے کہ یہ شخص اس کی آمدنی کھائے۔ قرآن میں ربٰو کو حرام قرار دیا گیا ہے اور ربٰو کے معنی زرِ اصل سے زیادتی کے ہیں۔ لہٰذا زرِ اصل سے زیادہ لینے کی کوئی شکل بھی ہو، وہ ربٰو میں داخل ہوگی اور حرام قرار پائے گی۔ بنا بریں کسی کا مکان گرو رکھکر کرایہ وصول کرتے جانا یا زمین رہن رکھکر اس کی آمدنی کھاتے جانا (اور مکان کے کرایہ اور زمین کی آمدنی کو زرِ اصل میں محسوب نہ کرنا) ربٰو ہے جو نصوص قرآنی کی رو سے حرام ہے۔

مندرجہ بالا آیت سے یہ واضح ہے کہ قرآن کی رو سے تحریر کافی ضمانت سمجھی جاتی ہے اور کسی چیز کا بطور ضمانت اپنے قبضہ میں لے لینا اسی وقت ہوگا جب تحریر ممکن نہ ہو۔ اس شکل میں بھی اگر قرض دینے والا، اعتماد کرے تو پھر کسی چیز کو بطور ضمانت رکھ لینے کا بھی

سوال پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن آجکل تو قرضہ کی تحریریں نہیں، رہن یا قبضہ کی باقاعدہ تحریریں ہوتی ہیں اور انھیں رجسٹری بھی کرایا جاتا ہے۔ اور ان چیزوں سے انتفاع شیر مادر کی طرح حلال سمجھا جاتا ہے۔

۴۔ مختلف معاشرتی مسائل

رسالپور ہی سے ایک اور صاحب حسب ذیل امور کے متعلق دریافت فرماتے ہیں کہ قرآن کی رو سے ان کی پوزیشن کیا ہے۔

(۱) بچہ پیدا ہونے پر اس کے کان میں اذان دینا؟

(۲) عقیقہ کرنا؟

(۳) ختنہ کرنا؟

(۴) مردہ کو غسل دینا۔ کفن پہنانا۔ نماز جنازہ پڑھنا۔ میت کو قبلہ رو کر کے دفن کرنا؟

جواب: یہ تمام امور معاشرتی ہیں نہ کہ دینی۔ کسی معاشرہ میں اگر بعض باتیں اس قسم کی رائج ہوں جو دین کے کسی حکم یا اس کی عام تعلیم کے خلاف نہ جاتی ہوں تو انھیں معاشرتی تقریبات کے طور پر منا لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ایسی تقریبات معاشرتی یک جہتی کے لئے مفید ہوتی ہیں۔ اور اور خوشی کی تقریبات سے تو زندگی میں لوچ پیدا ہوتی ہے جو گداز حیات کے لئے بڑی ضروری چیز ہے۔ لیکن جو قوم روٹی تک کو محتاج ہو رہی ہو اس میں زندگی کی لوچ اور گداز حیات کا تصور ہی کہاں پیدا ہو سکتا ہے۔

(۵) نابالغ یا بالغ لڑکے لڑکی کی منگنی کرنا؟

نابالغ لڑکے یا لڑکی کی منگنی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ نکاح کیلئے زوجین کی رضامندی شرط ہے اور رضامندی کے لئے سن بلوغت ضروری ہے۔ باقی رہا بالغ لڑکے یا لڑکی کی منگنی۔ سو اگر بالغ لڑکا اور لڑکی اپنے نکاح پر رضامند ہو گئے ہیں لیکن کسی وجہ سے نکاح میں کچھ تاخیر ہے تو ان کا باہمی وعدہ منگنی کہلا سکتا ہے۔ لیکن یہ کسی شکل میں بھی نکاح کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس کی قانونی حیثیت کچھ نہیں ہوگی۔ قرآن صرف نکاح کا ذکر کرتا ہے اس لئے اس قسم کے وعدوں سے احتراز اچھا ہے کیونکہ اس سے بعض اوقات بڑی معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور یہ جو ہمارے ہاں آجکل عام رواج ہو رہا ہے کہ جوان لڑکے اور لڑکی کا نکاح کر دیا اور پھر "رخصتی" کے لئے برسوں کی تاریخ ڈالدی تو یہ چیز قرآن کے منشاء نکاح کے خلاف اور نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے بڑی خرابیوں کی موجب ہے۔ قرآن کی رو سے نکاح کے بعد میاں اور بیوی کو آپس میں ازدواجی تعلقات پیدا کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا اس لئے نکاح کے بعد لڑکے اور لڑکی کو آپس میں ملنے نہ دینا نکاح سے مذاق کرنا ہے۔

(۶) کیا یہ ضروری ہے کہ نکاح مُلّا ہی پڑھائے؟

جب قرآن نازل ہوا ہے تو ملا کا وجود ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہ حضرت بہت بعد کی پیداوار ہیں۔ لہٰذا نہ صرف نکاح میں بلکہ دوسرے معاملات میں بھی مُلّا کی ضرورت غیر قرآنی ہے، یہ کام مسلمانوں کو خود کرنے چاہئیں۔

(۷) ہمارے ہاں ایک رسم ہے کہ قبر کے اردگرد ملاؤں کا ایک دائرہ بیٹھ جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کی طرف قرآن کریم کو منتقل کرتا جاتا ہے

اور پھر آخری مُلّا اسے کچھ روپے کے عوض میت کے وارث کو دیدیتا ہے اور اس کے عوض سمجھا جاتا ہے کہ میت کے گناہ ساقط ہو گئے۔

اسی طرح قرآن ختم کرا کر یا درود شریف پڑھوا کر میت کو ایصالِ ثواب کرایا جاتا ہے۔

جب آپ ایسا گروہ پیدا کر دیں گے جس کا ذریعۂ معاش کچھ نہ ہو تو وہ اپنی روٹی کے لئے کوئی نہ کوئی صورت تو پیدا کرے گا ہی۔ یہ سب رسومات اسی بیکار گروہ کے حصولِ معاش کی صورتیں ہیں جن کے تصور سے دین کانپ اٹھتا ہے۔

اور ایصالِ ثوابُ کے غیر قرآنی عقیدہ میں تو بڑے بڑے لوگ پھنسے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ یہ عقیدہ قانونِ مکافاتِ عمل کی جڑ کو کاٹ دیتا ہے جو قرآنی تعلیم کا اصل الاصول ہے۔

۵۔ ولی اللہ

گجرات سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ

جو شخص نماز روزہ ترک کر دے، گالیاں دے اور ناجائز حرکات کرے کیا وہ ولی اللہ ہو سکتا ہے؟ نیز مست لوگوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے، وہ کس طرح مست ہو جاتے ہیں اور وہ ناجائز حرکات کیوں کرتے ہیں؟

جواب: ولی اللہ کسی خاص شخص کو نہیں کہتے اور نہ ہی اولیاء اللہ کا کوئی خاص گروہ ہوتا ہے۔ قرآن کی رو سے ہر مومن ولی اللہ ہوتا ہے۔ یعنی وہ اللہ کو دوست رکھتا ہے اور اللہ اس کا دوست اور کارساز ہوتا ہے۔ اللہ کی دوستی کے معنی ہیں اس کے قانون کی پوری پوری اطاعت۔ ہمارے ہاں جو اولیاء اللہ کا الگ گروہ سمجھا جاتا ہے، یہ عقیدہ عیسائیوں کی خانقاہیت سے لیا گیا ہے جہاں (SAINTS) ہوتے ہیں۔

باقی رہے مست۔ سو اس کی صورت یہ ہے کہ قرآن علم و عقل، فہم و بصیرت، تدبر و تفکر، برہان و دانش کی تعلیم دینے آیا تھا۔ لہٰذا کوئی شخص جسقدر زیادہ علم و عقل سے کام لیتا تھا اسی قدر واجب العزت قرار پاتا تھا۔ لیکن جب مسلمانوں نے قرآن چھوڑا تو عزت اور تقربِ خداوندی کے معیار بھی الٹے ہو گئے اور یہ سمجھا جانے لگا کہ کوئی شخص جسقدر جاہل اور بیوقوف ہو گا اتنا ہی زیادہ خدا کا مقرب ہو گا۔ حتیٰ کہ اٰهل الجنة بُلهٌ کی حدیث بھی وضع کر لی گئی جس کے معنی یہ ہیں کہ جنتی لوگ بیوقوف ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب خدا کے مقرب ہونے کا معیار عقل کی کمی قرار پا گیا تو جو شخص بالکل فاتر العقل ہو جائے وہ سب سے بڑا مقرب ہو گا۔ انہی کو ہمارے ہاں مست یا مجذوب کہتے ہیں یعنی بالکل پہنچا ہوا جس کے متعلق سعدیؔ نے کہا تھا کہ ؎ کار اکہ خبر شد خبرش باز نیامد ۔ باقی رہا یہ کہ لوگ مست کیسے ہو جاتے ہیں تو یہ سوال کسی ڈاکٹر سے پوچھنا چاہئے جو بتا سکے گا کہ لوگ پاگل کس طرح ہو جاتے ہیں۔

لیکن آپ کو یہ نہیں پوچھنا چاہئے تھا کہ وہ پاگل کس طرح ہو جاتا ہے۔ پوچھنا یہ چاہئے تھا کہ جو لوگ اس پاگل کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں انھیں کیا ہو جاتا ہے؟

سلیم کے نام خطوط
محترم پرویز صاحب کے قلم سے۔ ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں اسلام کے متعلق جس قدر شکوک پیدا ہوتے ہیں
ان کا نہایت شگفتہ، شاداب سا شگفتہ انداز میں تسکین بخش جواب۔ عقائد، نظریات، جیسے خشک اور کٹھن مسائل پر یہ
بحث کی گئی ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کسی خشک فلسفیانہ بحث کو پڑھ رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں وہ دقیق اور مشکل مسائل حل کر کے رکھ دیئے گئے ہیں جنہیں ضخیم مجلدات میں بھی حل نہیں
کیا جا سکا تھا۔ ضخامت بڑے سائز کے ۵۰۰ صفحات۔ مجلد مع حسین گرد پوش۔ قیمت چھ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

حقایق و عبر

(۱) شرعی سزائیں

پاکستان کی مجلس دستور ساز کے گذشتہ اجلاس میں جب بعض غیر مسلم اراکین کی طرف سے اسلامی قوانین کے فرسودہ اور دور از کار ہونے کے ضمن میں یہ کہا گیا کہ قرآن نے بعض جرائم کی جو سزائیں مقرر کی ہیں وہ بڑی وحشت انگیز اور ڈراؤنی ہیں تو اس کے جواب میں مسلم اراکین نے ایسی معروضی (APOLOGETIC) روش اختیار کی جس سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ قرآن میں ان سزاؤں کا ذکر ان پر سخت ناگوار گذر رہا ہے اور اگر ان کا بس چلے تو ان احکام کو قرآن سے نکال کر ہی دم لیں۔ طلوع اسلام میں ان اراکین کی اس جھجک اور شرمیلے پن کا محض ضمناً تذکرہ آیا تھا، کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ یہ بیچارے معذور ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ اس باب میں ہمارے حاملان شرع مبین حضرات علمائے کرام بھی ان افرنگ زدہ تعلیم یافتہ نوجوانوں سے کچھ کم جھجک اور شرم محسوس نہیں کرتے۔ وہ بھی جب ان شرعی سزاؤں کا ذکر کرتے ہیں تو کچھ اس انداز سے کہ

چوزاہدے کہ بہ بزم شراب می آید

چنانچہ صدق (لکھنؤ) کی ۱۴ دسمبر کی اشاعت میں مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "اسلامی سزائیں" اس کی تمہید سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی سزاؤں کے متعلق بعض ترکوں کی طرف سے کوئی بیان شائع ہوا ہے جس پر تنقید کرتے ہوئے گیلانی صاحب نے یہ مراسلہ تحریر فرمایا ہے۔ وہ ان ترکوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ان احمقوں کو معلوم نہیں کہ سیاسی معاملات میں اسلام نے حکومت کے اختیار تمیزی اور صوابدید میں کتنی غیر معمولی کشادگی اور وسعت رکھی ہے قیام امن و امان اور انسداد جرائم ہی کے سلسلہ میں دیکھئے کہ لے دے کر جان کے سلسلے میں قصاص و دیت، مال کے قصہ میں صرف حد سرقہ (چوری کی سزا) اور آبرو کی راہ میں حد زنا کے سوا کون نہیں جانتا کہ "تعزیرات" کے نام سے فقہاء نے حکومت کے اختیارات کو کہاں تک وسیع کر رکھا ہے۔ اور جانی مالی عرضی۔ (آبرو) کی بے شمار صورتوں میں جو بے ضابطگیاں پیدا ہوتی ہیں ان میں صرف تین ہی شکلوں کے متعلق یہ ہیں۔ تہدیدی قوانین اسلام میں جو پائے جاتے ہیں کوئی شبہ نہیں کہ صورۃً کافی مہیب اور ڈراؤنے ہیں لیکن ان کے عملی نفاذ کے لئے جو شرائط رکھدیئے گئے ہیں مثلاً زنا میں بجائے دو گواہوں کے قرآن ہی میں چار گواہوں کی ضرورت بتائی گئی ہے۔ شہادت اور گواہی بھی کیسی؟ چشم دید۔ سرمہ دانی میں سلائی کا مشاہدہ۔ عدم ثبوت میں خود گواہوں کیلئے حد قذف کا خطرہ۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ بقول فقہاء، اسلام کی پوری تاریخ میں شہادت کی راہ سے اس سزا کے نفاذ کا موقع کبھی پیدا نہیں ہوا۔ اور یہی حال چوری والی سزا کا ہے۔ کتنے مال کو کس حال میں کس نیت سے، کس طریقے سے، چرانے والے نے کہاں سے چرایا؟ یہ ایسے سوالات ہیں کہ قطع ید کی سزا بھی شہادت کی راہ سے فقہاء ہی نے لکھا ہے کہ حد سے زیادہ نادر ہے۔ انتہا یہ ہے کہ کان سے کسی عورت کی بالیاں کش مکش کے بعد نوچ لینے میں چور کامیاب ہو گیا تو یہ سرقہ

نہیں، چھین جھپٹ ہے۔ شہادت کے سوا سزا کا استحقاق اقرار سے ہو سکتا ہے لیکن زنا اور سرقہ دونوں ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرز عمل کو اختیار فرمایا اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اقرار کی حوصلہ افزائی آپ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مجرم کو موقعہ دیا گیا کہ اپنے اقرار سے مکر جائے۔ کوئی تاویل کر لے۔ اسی سے تو سمجھا جاتا ہے کہ نفاذ کے لئے نہیں بلکہ تہدیداً ڈرانے دھمکانے کے لئے بظاہر قصداً ان قوانین کو مہیب قالب عطا کیا گیا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ اسلامی سزاؤں کے متعلق حضرت مولانا کے ارشادات کیا ہیں؟ وہ فرماتے ہیں کہ اس میں شبہ نہیں کہ یہ قوانین صورۃً کافی مہیب اور ڈراؤنے ہیں لیکن ان کی صورت اور شکل سے ڈرنا نہیں چاہئیے کیونکہ ان کے نفاذ کیلئے جو شرطیں رکھدی گئی ہیں ان کی رو سے ان کا نفاذ ممکن ہی نہیں رہتا۔ اس لئے یہ قوانین نفاذ کیلئے ہیں ہی نہیں محض ڈرانے دھمکانے کے لئے انھیں مہیب قالب عطا کر دیا گیا ہے۔ اور یہ مہیب قالب عطا کرنے والا ہے کون؟ خود اللہ تعالیٰ۔

خدا کے بعد اس کے رسولؐ کی باری آتی ہے ان کے متعلق مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ مجرم آکر ارتکاب جرم کا اقرار کرتا تھا اور رسول اللہ اسے موقعہ دیتے تھے کہ وہ اپنے اقرار سے مکر جائے یا اس کی کوئی تاویل ہی کر لے۔

یہ ہے خدا اور اس کے رسول کا وہ تصور جو ہمارے علمائے کرام کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے اور نہ لکھنے والے کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے اور نہ شائع کرنے والے کے دل میں کہ دنیا اس قسم کے خدا، ایسے رسول اور ایسے ضابطۂ قوانین کے متعلق کیا رائے قائم کرے گی۔ لیکن انھیں اس سے کیا غرض۔ فقہ کی کتابوں میں یہ شرائط لکھدی گئیں اور حدیث کے مجموعوں میں اس قسم کی روایتیں حضور رسالتمآب صلعم کی ذات گرامی کی طرف منسوب کر دی گئیں اور ان کا نام رکھ لیا گیا شریعتِ حقہ۔ اب ان حضرات کا فریضہ اس شریعت حقہ کی حفاظت رہ گیا۔ خواہ اس حفاظت میں نہ خدا باقی رہے نہ اس کا رسول، نہ قرآن باقی رہے نہ اس کے قوانین۔ قرآنی سزاؤں کے متعلق ہم اس سے پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور اس کے بعد بھی کبھی مزید تفصیل سے لکھا جائے گا۔ اس موقعہ پر ہم اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ جناب گیلانی نے جو یہ ارشاد فرمایا ہے کہ زنا کے الزام کے ثبوت میں قرآن نے یہ کہا ہے کہ اس کیلئے چار چشم دید گواہوں کی ضرورت ہے تو یہ قرآن پر اتہام ہے۔ قرآن نے ان گواہوں کی ضرورت مبادی زنا کے لئے قرار دی ہے نہ کہ زنا کے فعل کے لئے۔

بہرحال مولانا گیلانی صاحب کے ان ارشادات کے بعد مجلس دستور ساز کے وہ ممبر واقعی معذور سمجھے جائیں گے جنھوں نے مجلس کے اجلاس میں ایسی مجوبانہ روش اختیار کی تھی۔ اقبال کی حیرت بجا تھی جب اس نے کہا تھا کہ

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی   اِس دَور کے مُلّا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی؟

۲۔ کتاب اور سنت کی مشکل

ہمارے ہاں ایک پرانی مثل رہی ہے کہ "غریب کی جورو سب کی بھابھی" کیونکہ مسلمانوں میں مذہب بے چارہ سب سے زیادہ غریب اور مظلوم ہے اسلئے یہ ہمیشہ سب کی بھابھی بنا رہا ہے۔ پہلے زمانہ میں چونکہ مذہب کا تعلق ارباب مذہب سے ہوتا تھا اسلئے یہ حضرات اس بیچارے کو رگیدتے رہتے تھے۔ جو کچھ کسی کے جی میں آیا کہدیا اور اس کے بعد

یہ الفاظ بڑھا دیئے کہ یہ اسلام کا حکم ہے۔ اسلام بیچارے میں یہ ہمت ہی نہ تھی کہ وہ ان سے پوچھتا کہ حضور مجھ بے گناہ کے سر یہ الزام کیوں تھوپا جا رہا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ فرقہ پر فرقہ بنتا چلا گیا اور ہر فرقہ کی ہر بات اسلام کے مطابق کہی جاتی رہی۔ چنانچہ آج سیاہ بھی اسلام ہے اور سفید بھی اسلام ہے، سرخ بھی اسلام ہے اور سبز بھی اسلام ہے۔ اسلام کے سوا باقی ہر چیز اسلام ہی اسلام ہے۔

یہ پرانے زمانے کی باتیں تھیں لیکن اب یہی پوزیشن ہماری سیاسی پارٹیوں نے اختیار کر لی ہے بالخصوص اُسی وقت سے جب سے مسلم لیگ کی "مامور من اللہ" پارٹی نے یہ اعلان فرما دیا ہے کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق قانون بنائے گی۔

پنجاب میں جب میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ کی مسلم لیگی وزارت قائم تھی تو اس وقت مسلم لیگ کے ایک فیصلے کے تتبع میں کچھ زرعی اصلاحات نافذ کی گئی تھیں اور انھیں عین کتاب و سنت کے مطابق بتایا گیا تھا۔ اب وہاں جناب دولتانہ کی بجائے ملک فیروز خاں نون کی وزارت قائم ہوئی ہے تو انھوں نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ زرعی اصلاحات قرآن اور سنت کے یکسر خلاف ہیں۔ اس پر دولتانہ صاحب نے انھیں چیلنج دیا ہے کہ وہ ثابت کریں کہ یہ اصلاحات کس طرح قرآن و سنت کے خلاف ہیں۔ اس کا جواب تو صاف تھا کہ یہ اصلاحات اس وقت قرآن و سنت کے مطابق اس لئے تھیں کہ اس زمانے کا وزیر اعظم ان کا نفاذ ضروری سمجھتا تھا اور یہ اصلاحات آج قرآن و سنت کے اس لئے خلاف ہیں کہ موجودہ وزیر اعظم ان کی تنسیخ یا ترمیم کو ضروری سمجھتا ہے۔ لیکن ملک صاحب نے اس جواب دینے کے بجائے اسلام کا جمہوری طریقہ اختیار کرنا پسند فرمایا ہے۔ چنانچہ انھوں نے پچیس غیر سرکاری اور پانچ سرکاری اراکین پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کر دی ہے جو یہ فیصلہ کریگی کہ یہ اصلاحات کتاب و سنت کے مطابق ہیں یا اس کے خلاف۔ پچیس حضرات پنجاب کے بڑے بڑے زمیندار ہیں اور پانچ سرکاری ممبروں میں پنجاب کے دو فائننشل کمشنر، ڈائرکٹر محکمۂ زراعت، رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز اور پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ معاشیات کے صدر ہیں۔ یہ کمیٹی بتائے گی کہ زمینوں کی تقسیم کتاب و سنت کے مطابق کس طرح ہونی چاہیئے۔

جہانتک "سنت" کا تعلق ہے، معاملہ بالکل صاف ہے۔ کچھ دو سال اُدھر کا ذکر ہے حکیم حیدر زماں صدیقی مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں یہ لکھا تھا کہ زمینوں کا بٹائی پر دینا شرعاً ناجائز ہے اور اسکی تائید میں انھوں نے بہت سی احادیث بھی نقل کی تھیں اس کے جواب میں جماعت اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے فرمایا تھا کہ یہ غلط ہے۔ شریعت کی رو سے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ جتنی زمین چاہے اپنی ملکیت میں لیلے اور پھر اسے بٹائی پر دیکر کاشتکاروں کے پسینہ سے اپنے لئے عشرت سامانیاں بہم پہنچالے۔ اسکی تائید میں بھی انھوں نے بہت سی حدیثیں پیش کر دی تھیں۔ لہٰذا "سنت" کی رو سے تو دولتانہ صاحب کے وقت کی زرعی اصلاحات بھی شریعت کے مطابق قرار پا جائینگی اور اس کے بعد ان اصلاحات کی تنسیخ بھی عین مطابق شریعت قرار دیجا سکے گی لیکن اصل دشواری پیش آئیگی قرآن کے متعلق جس کی رو سے زمین پر انفرادی ملکیت ہی جائز نہیں۔ یہاں پہنچکر نہ دولتانہ صاحب کی اصلاحات قرآن کے مطابق قرار پائیں گی اور نہ نون کمیٹی کی سفارشات۔

قرآن کے متعلق یہی دشواری تھی جس کے پیش نظر علما حضرات ارباب حکومت سے پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ کہیں یہ رزولیوشن نہ پاس کر لینا کہ ہمارے قوانین کی بنیاد قرآن پر ہوگی۔ اگر یہ غلطی کر بیٹھے تو ہماری پیشوائیت تو جائے گی ہی، اس کے ساتھ تمہاری زمینداریاں اور کرخنداریاں بھی باقی نہیں رہیں گی۔ اسلئے اس کی احتیاط رکھو کہ

ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں

نقد و نظر

روزنامہ "نوائے وقت" لاہور کی ۲۵ نومبر ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں مطبوعاتِ ادارۂ طلوع اسلام پر حسب ذیل تبصرہ شائع ہوا ہے:-

(۱) قرآنی فیصلے

شائع کردہ ادارۂ طلوع اسلام کراچی. صفحات ۴۰۸. قیمت مجلد چار روپے

طلوع اسلام عرصہ دراز سے قرآن کی ترجمانی بایں انداز کر رہا ہے کہ اسلام جس نظم اجتماعی کا تصور پیش کرتا ہے اس کی عملی تشکیل کے جملہ پہلو نگاہوں کے سامنے آجائیں. تحریک پاکستان میں اس مجلہ نے بیش از بیش حصہ لیا اور اس نے سارا زور ایک نکتہ کی تشریح پر صرف کیا کہ

نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

قیام پاکستان کے بعد اس کا دور ثانی شروع ہوا. اب اس کے سامنے ایک لحاظ سے مختلف مقصد تھا. اب اسے اس قرآنی نظام کو واضح اور مقبول کرنا تھا جس کی ترویج و نفاذ کیلئے یہ قطعۂ ارض ہمیں حاصل ہوا تھا جن حضرات نے طلوع اسلام کے پاکستانی دور کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ۱۹۴۸ء سے اس کا اجراء کراچی سے ہوا، اب تک اس نے کس قدر بیش قیمت لٹریچر پیش کیا ہے. قرآن کی اس تفسیر کا موقع پاکستان میں ہی میسر آسکتا تھا. ایک تو اس لئے کہ پاکستان قرآن کے نام پر ہی معرض وجود میں آیا تھا اور دوسرے اسلئے کہ اس گلستان میں اقبالؒ فکر و ایمان کا وہ شجر طیبہ بو گئے تھے جس کی جڑیں (قرآن کے الفاظ میں) زمین گیر تھیں اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں. گذشتہ پانچ سال میں طلوع اسلام نے قریباً زندگی کے ہر پہلو پر قرآنی روشنی ڈالی ہے اور پھر قارئین کے استفسارات کا تسلی بخش جواب دیا ہے. اس ضمن میں اس کا "باب المراسلات" خصوصی اہمیت حاصل کر گیا اور اس میں روزمرہ کے بیشتر مسائل نہایت واضح طور پر آگئے اور ان کے متعلق قرآن کے فیصلے سامنے آگئے. اب ادارۂ طلوع اسلام نے باب المراسلات کے ان مضامین متفرقہ کو کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے. ان مضامین کا انداز مفتیانہ نہیں درحقیقت یہ انداز طلوع اسلام کے مزاج کے یکسر خلاف ہے. اس کی دعوت علی وجہ البصیرت بھی ہے اور اس احساس پر بھی قائم ہے کہ پہلے اصول و مبادیات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے اور اس کے بعد فروعات کو ان کی روشنی میں دیکھا جائے. چنانچہ طلوع اسلام نے نہ محض یہی بتایا ہے کہ فلاں باب میں قرآن کا فیصلہ کیا ہے بلکہ یہ کہ قرآن ایسا فیصلہ دیتا کیوں ہے. اس سے قرآن کی دعوت کی اصل و اساس بھی بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے.

چیدہ چیدہ موضوع یہ ہیں:- نماز. نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ، صدقہ و خیرات. قربانی. غلام اور لونڈیاں. ایصال ثواب. اوقاف، تعدد ازدواج. شرعی سزائیں. حرمتِ شراب. رجم. شب برات. رسولؐ کا سایہ. آپؐ کا علم غیب. حفاظتِ قرآن. ناسخ و منسوخ. حیات بعد الممات. آدم سانی ارتقاء. قومی ملکیت. نیابت الٰہی وغیرہ وغیرہ. محض یہی نہیں بلکہ ان کے تضمنات میں عقائد و اعمال کی بیشتر الجھنیں صاف کر دی گئی ہیں جس سے ہمارے معاشرے کی بہت بڑی ضرورت پوری ہو جاتی ہے.

(۲) جشن نامے شائع کردہ ادارۂ طلوع اسلام کراچی۔ صفحات ۲۵۶ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے۔

یہ ادارۂ طلوع اسلام کے سلسلہ مطبوعات کی ایک اور کتاب ہے۔ ادارہ کے الفاظ میں یہ کتاب "پاکستان کی چھ سالہ زندگی پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے بے لاگ تبصرہ، ہمدردانہ تشخیص اور مشفقانہ علاج ہے۔ اور ان اہم سوالات کا صحیح صحیح جواب" کہ ہم کیا تھے؟ کیا ہو گئے؟ ہمیں کیا ہونا چاہیے؟ پیش آہنگ میں کتاب کا تعارف یوں کرایا گیا ہے:

"پاکستان میں طلوع اسلام کے سامنے دو کام تھے۔ سلبی حیثیت سے اس خلفشار کی روک تھام (جو اربابِ قیادت کی غلط کاریوں اور ناعاقبت اندیشیوں سے پیدا ہو گیا ہے) اور مثبت حیثیت سے ایسی فضا کا پیدا کرنا جو قرآنی نظامِ ربوبیت کے سازگار ہو۔ . . . یوں تو طلوع اسلام کی ہر اشاعت اس مقصد کے لئے وقف رہتی ہے لیکن اس نے جشن آزادی کی سالانہ تقریب کو ہمیشہ محاسبہ نفس کی تقریب سمجھا اور ایک ایک گوشہ کا جائزہ لیکر اپنے نتائج کو اربابِ درد و فکر کے سامنے پیش کر دیا۔ چونکہ یہ تمام جائزے اور محاسبے طلوع اسلام کے اوراق میں بکھرے پڑے تھے جن کی وجہ سے یہ بیک وقت سامنے نہیں آسکتے تھے اسلئے ضروری سمجھا گیا کہ انھیں یکجا مجموعہ کی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ شروع میں چند ایسے بکھرے ہوئے عنوانات بھی ہیں جو بظاہر مسکراہٹوں کا انداز لئے ہیں لیکن جو درحقیقت خندہ زخمِ جگر ہیں ..... اس مجموعے کے پیش کرنے سے مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے ماضی کی کوتاہیوں اور غلط اندیشیوں سے تجربہ حاصل کر کے آنے والے خطرات سے محفوظ رہ سکیں اور اس نوزائیدہ مملکت کے سفینۂ برگ گل کو نہایت حفاظت سے ساحلِ مراد تک لے جائیں۔"

خود کتاب کے عنوان "جشن نامے" میں یہ طنز ہے کہ ہم نے قومی تقریبات کو جشن منانے کا موقع سمجھ لیا اور ان کی کماحقہ حقیقت نہیں سمجھ سکے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یہ مواقع ایک ایک کر کے ضائع ہوئے اور آج چھ سال کے بعد بھی ہم وہیں ہیں جہاں سے چلے تھے۔ طلوع اسلام نے ایک اچھوتے انداز میں یہ حقیقت بتلانے کی کوشش کی ہے۔ اس نے نہ محض یہ حقیقت جتائی ہے بلکہ بتایا ہے کہ تہوار کیسے منائے جا سکتے تھے اور قومی زندگی میں ان کی کیا اہمیت ہے۔ مضامین جن میں بعض ایک ایک صفحے کے بھی ہیں، مزاح بھی ہے اور طنز بھی۔ اس میں مسکراہٹیں بھی ہیں اور آنسو بھی، نشتر بھی ہیں اور مرہم بھی

ماہوار مجلہ "ہمایوں" (لاہور) کے سالنامہ (شائع شدہ جنوری ۱۹۵۳ء) میں ادارۂ طلوع اسلام کی مطبوعات پر حسب ذیل تبصرہ شائع ہوا ہے:-

"ادارۂ طلوع اسلام" نے پچھلے پندرہ سال میں جس طرح پسماندہ قوم کو اخلاقی اور دینی طور پر جگانے اور ابھارنے کی کوشش کی ہے وہ ہر لحاظ سے تحسین و آفرین کے لائق ہے۔ اس نے اگر ایک طرف مغرب زدہ نوجوانوں کو دہریت اور مادیت سے روکا ہے تو دوسری طرف اس نے ہمارے ملاؤں اور مذہبی پیشواؤں کی دقیانوسیت اور خود غرضی کی قلعی کھول کے رکھدی ہے۔ اس ادارے کے روحِ رواں جناب چودھری غلام احمد پرویز ہیں۔ جنھوں نے بغیر مولویت کا عمامہ پہنے محض اپنی بصیرت اور خلوص کی بنا پر قرآن کریم پر عبور حاصل کیا اور مسلمانوں کے جملہ شبہات و سیئات کا علاج اسی ایک سرچشمے کو ڈھونڈا اور قوم کے سامنے پیش کیا۔ وہ بڑے بڑے دعوے نہیں کرتے وہ محض ہمیں دعوت دیتے ہیں کہ ہم خود اپنی ہر مشکل کا علاج قرآن کے غیر مبہم بیانات میں دیکھ لیں۔

وہ اسلام کو محض مذہبی معاملات تک محدود نہیں رکھتے بلکہ سمجھتے ہیں کہ صحیح اسلام زندگی کے تمام شعبوں میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ زندگی ایک وحدت ہے اور اسلام توحیدِ الٰہی اور اتحادِ انسانیت کی سیدھی راہ ہے۔ حال ہی میں اس ادارے کی طرف سے تین بہت سودمند اور دلکش کتابیں شائع ہوئی ہیں جو اس قابل ہیں کہ تعلیم یافتہ مسلمان ان کا بغور مطالعہ کرے اور ان کی مدد سے اپنی اور دوسروں کی قلبی الجھنوں کو دور کرے۔

(۱) قرآنی فیصلے اس کتاب میں تمام وہ سوالات اور ان کے شافی جوابات درج ہیں جو مختلف امور کے متعلق رسالہ "طلوع اسلام" میں برسوں شائع ہوتے رہے۔ "لوگ جسے خدا کا حکم سمجھتے ہیں عموماً وہ خدا کا حکم نہیں ہوتا" نماز، زکوٰۃ، غلام اور لونڈیاں، یتیم پوتے کا حصہ، تعدد ازواج، ایک ہندو کا خط، عذاب قبر۔ اسلامی نظام کیا ہے اور بیسیوں اور موضوعات ہیں جن پر ایک لطیف پیرائے میں اصلیت بیان کی گئی ہے آخری موضوع پر لکھا ہے کہ زمانہ کتنا ہی آگے بڑھتا چلا جائے عدل اور دیانت کے اصول اپنی جگہ قائم رہیں گے۔ قرآن نے اسی قسم کے مستقل اقدار دیئے ہیں" اور اس کے بعد کہا ہے کہ "ہر زمانے کے انسان اپنے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق ان غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت اور عقل و فکر کی رو سے اپنا نظام آپ وضع کریں۔

(۲) جشن نامے یہ ہے پاکستان کی چھ سالہ زندگی پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے بے لاگ تبصرہ۔ شروع میں ہم دیکھتے ہیں کہ "طلوع اسلام کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ خدا کی اس وسیع و عریض زمین کے کسی ایک گوشے میں (ہی سہی) اس نظام ربوبیت کو متشکل دیکھ لے جسے قرآن کاروانِ انسانیت کی آخری منزل قرار دیتا ہے۔" روزمرہ کے موضوعات پر ہلکے پھلکے خیال انگیز مضامین ہیں۔ اخیر میں قرآنی نظام ربوبیت کے خط و خال بیان کئے ہیں کہ "دنیا میں ہر شخص میں فطرت کی طرف سے انسانیت کے جوہر مضمر کر کے رکھ دیئے گئے ہیں جو صفاتِ خداوندی کے پرتو ہیں۔ مقصودِ حیات یہ ہے کہ ان مضمر جوہروں کی مکمل نشوونما کی جائے۔ اس کے لئے اجتماعی زندگی کا وجود ناگزیر ہے۔ قرآن اس معاشرے کی تکمیل چاہتا ہے جس میں ان صلاحیتوں کی نشوونما ہو سکے۔ اس غرض سے رزق کے تمام سرچشمے نظام اجتماعی کی تحویل میں ہونگے تاکہ ان سے تمام افراد کی ربوبیت اور نشوونما کا انتظام ہو سکے۔"

(۳) سلیم کے نام (خطوط کا مجموعہ) یہ یقیناً پرویز صاحب کی سب سے دلکش اور عام فہم کتاب ہے جس میں وہ گویا ہر مسلمان نوجوان کو مخاطب کرتے ہیں۔ ان خطوط کے موضوعات ایسے ہیں جن کا تعلق ہماری روزمرہ کی مذہبی معاشری اور سیاسی زندگی سے ہے۔ ہماری نمازیں اور روزے کیوں بے نتیجہ رہتے ہیں۔ ان جوڑ شادیاں، گاؤں والوں کی جہالت و غربت کی الم انگیز داستان۔ اسلامی نظام کے بنیادی اصول، مغربی اور قرآنی تہذیب کا بنیادی فرق۔ کمیونزم اور اسلام۔ قرآنی نظامِ ربوبیت۔ انسان کو اخلاقی ضوابط کا پابند کیسے بنایا جا سکتا ہے؟۔ خدا کا تصور۔ وغیرہ۔ ان خطوط میں علمی مقالوں کی سی گہرائی اور کہانیوں کی سی دل آویزی یکجا ہو کر قاری کو مسحور کر دیتی ہیں لیکن پرویز صاحب کا مدعا تفریح نہیں۔ تعارف میں وہ لکھتے ہیں کہ "میری تمام کاوشوں کا مقصد یہ ہے کہ جو کچھ میں نے قرآن سے سمجھا ہے اسے کسی نہ کسی طرح قوم کے نوجوانوں تک پہنچا جاؤں"۔ پھر قرآنی نظامِ ربوبیت کے ضمن میں کہتے ہیں کہ "میں فطرت کے خاموش اشاروں سے سمجھ رہا ہوں کہ زمانہ خود قرآنی تصوراتِ زندگی کو اپنانے کیلئے مضطرب و بیقرار ہے اور وہ وقت شاید قریب آ رہا ہے جب "زمین اپنے پروردش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی"۔

قیمت: تینوں کتابوں کی قیمت علی الترتیب چار روپے۔ اور اڑھائی روپے اور چھ روپے ہے۔ ملنے کا پتہ: ادارۂ طلوع اسلام کراچی۔

رفتارِ عالم

کوریا کا میدانِ کارزار جو تین سال سے کرۂ ارض کو عالمگیر جنگ سے بچائے چلا آرہا ہے، ابھی تک کوئی فیصلہ کن صورت اختیار نہیں کرسکا اور دنیا بدستور بیم و رجا کی کشمکش میں ہے۔ سیاسی کانفرنس کے مذاکرات ۱۲ دسمبر ۱۹۵۳ء کو اقوام متحدہ کے نمائندے مسٹر ڈین نے اس بنا پر موقوف کر دیئے تھے کہ اشتراکی نمائندوں نے امریکہ پر بدعہدی کا الزام لگایا تھا۔ انھوں نے اعلان کیا تھا کہ جب تک اشتراکی اس الزام کو واپس نہیں لیں گے وہ دوبارہ مذاکرات شروع نہیں کریں گے۔ اِدھر یہ مذاکرات منقطع ہیں، اُدھر جنگی قیدیوں کا معاملہ نازک تر ہوتا جارہا ہے۔ اس وقت پنچ ارکانی غیر جانبدار کمیشن کے ماتحت کم و بیش ۲۲ ہزار قیدی ہیں جنھیں اشتراکی افہام و تفہیم سے واپس لیجانے پر رضامند کر رہے ہیں۔ اس افہام و تفہیم کے لئے تین ماہ کی میعاد مقرر کی گئی تھی جو ۲۲ جنوری کو ختم ہو رہی ہے۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ اس تاریخ تک جو قیدی گھروں کو واپس جانے پر رضامند نہیں ہوں گے انھیں رہا کر دیا جائے گا۔ یہ مرحلۂ افہام و تفہیم بہت دشوار گذار و صبر آزما رہا ہے یہانتک کہ ابھی تک بہت سے قیدیوں سے براہ راست بات بھی نہیں ہوسکی اور ۲۳ جنوری کی فیصلہ کن ساعت سر پر آپہنچی ہے۔ غیر جانبدار کمیشن اس تاریخ کے بعد خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اس کی طرف سے بڑے تذبذب کے بعد بالآخر یہ فیصلہ ہوا ہے کہ وہ تمام جنگی قیدیوں کو متعلقہ فریق قابض کے حوالے کر دیگا۔ اقوام متحدہ کی کمان نے یہ انتظام شروع کر دیا ہے کہ ۲۲ جنوری کی شب کو ۱۲ بجے کے بعد قیدی اس کی تحویل میں آئیں تو انھیں رہا کر کے پھر اپنی تحویل میں لیکر فارموسا یا جنوبی کوریا میں بھیج دیا جائے۔ یہ فیصلہ بظاہر معاہدے کے مطابق معلوم ہوتا ہے لیکن اشتراکی ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا رہے ہیں کہ ان کے جنگی قیدی رہا نہ ہوں۔ اشتراکی چین کے وزیر اعظم نے اس پر شدید نکتہ چینی کی ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ سیاسی کانفرنس سے متعلق مذاکرات از سر نو شروع کئے جائیں اور جب تک جنگی قیدیوں کا کچھ تصفیہ نہیں ہوتا ان کو رہا نہ کیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ افہام و تفہیم کا سلسلہ خاطر خواہ طریق سے جاری نہیں رہا بلکہ اس میں اقوام متحدہ کی طرف سے طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالی جاتی رہیں جس سے ابھی تک کم و بیش ۸۵ فی صدی قیدیوں سے باتیں نہیں ہوسکیں۔ انھوں نے یہ بھی تقاضا کیا ہے کہ افہام و تفہیم کے تین ماہ کی قید کا مفہوم یہ ہونا چاہئے کہ ایک ایک دن کر کے پورے نوے دن اسی پر صرف کئے جائیں اور چونکہ ایسا نہیں ہوسکا اس لئے اس کا انتظام اب ہونا چاہئے۔ اقوام متحدہ کے نمائندے اس مطالبہ کو تسلیم نہیں کر رہے اور وہ اسی فیصلہ پر قائم ہیں کہ ۲۳ جنوری کو جنگی قیدی رہا کر دیئے جائیں گے۔ اس میں ایک خطرہ ہے اور وہ یہ کہ اگر اشتراکی فوجیں اس رہائی میں مزاحم ہوئیں تو کیا ہوگا۔ بظاہر اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ پھر سے جنگ کی طرح پڑ جائے گی۔ لیکن ابھی دیکھنا ہے کہ اشتراکی واقعی مزاحم ہونا پسند کریں گے یا نہیں۔

ہندوستان کی تگ و دو

ہندوستان اس کشمکش میں اپنی ثالثی اور قیادت کے لئے بدستور راستہ صاف کر رہا ہے۔ وہ کوریا کے مسئلہ کو پھر سے اقوام متحدہ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے۔ اس کی یہ خواہش ہے کہ جنرل اسمبلی کوریا میں اس کی

"حسن کارکردگی" پر مہر تصدیق ثبت کردے۔ امریکہ جنرل اسمبلی کے اجلاس کے حق میں نہیں۔ اس کا خیال یہ ہے کہ ۲۲ جنوری کے بعد ہندوستان اور اشتراکیوں کا رویہ دیکھ لیا جائے اور پھر اجلاس سے متعلق فیصلہ کیا جائے۔ ہندوستان نے امریکہ کو بے دست و پا بنانے کی یہ تجویز سوچی کہ جنرل اسمبلی کی ہندوستانی صدر مسز وجے لکشمی پنڈت نے تمام اراکین اسمبلی کو یہ تجویز بھیجدی کہ ۹ فروری کو جنرل اسمبلی کا خصوصی اجلاس منعقد ہو اور انھیں یہ بھی لکھدیا کہ وہ ۲۲ جنوری تک ہاں یا نہ کردیں۔ نیز جو قومیں خاموش رہیں گی ان کی خاموشی کو رضامندی پر محمول کیا جائے گا۔ یہ طریق کار غیر معمولی ہے اور امریکہ اسے خصوصیت سے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ یہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ امریکہ اس کے جواب میں کیا روش اختیار کرتا ہے لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس غیر معمولی شرط میں بھی امریکہ کیلئے تھوڑی سی گنجائش نکل آتی ہے۔ قیدیوں کی رہائی جنوبی کوریا کے وقت کے مطابق آدھی رات کو ہوگی اور اس کی رو سے امریکہ کو اپنے وقت کے مطابق ۲۲ جنوری کو جواب دینے کے لئے چودہ گھنٹے کا وقفہ مل جاتا ہے کہ وہ دیکھے کہ ہندوستان اور اشتراکی قیدیوں کی رہائی کے وقت کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اس سے مسز پنڈت کے عزائم کو یقیناً زک پہنچے گی۔

وزیر اعظم چین نے کوریا کی سیاسی کانفرنس کو غیر مشروط طور پر شروع کرنے کے مطالبہ کے ساتھ یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ برلن میں دول اربعہ کے وزرائے خارجہ کی جو کانفرنس منعقد ہو رہی ہے اس کے بعد دول خمسہ کی ایک کانفرنس منعقد ہونی چاہئے تاکہ بین الاقوامی کشیدگی کو کم کرنے کے ذرائع پر غور کیا جاسکے۔ اشتراکی چین اس کانفرنس میں اپنے آپ کو بھی شریک کرنا چاہتا ہے لیکن اقوام مغرب اس کی مخالفت کر رہی ہیں۔ یہ مطالبہ اس سے پیشتر روس متعدد مرتبہ کرچکا ہے لیکن اس کے مغربی حریف اسے تسلیم کرنے پر ہرگز راضی نہیں ہو رہے۔ لہٰذا ایسی کانفرنس کو کہ جس میں ایک فریق اشتراکی چین ہو، فی الحال خارج از بحث سمجھنا چاہئے۔ جہاں تک برلن کانفرنس کا تعلق ہے اس کی تاریخ انعقاد ۴ جنوری سے ۲۵ جنوری تک ملتوی ہوگئی ہے۔ البتہ یہ طے نہیں ہوسکا کہ اس کا انعقاد روسی علاقے میں ہو یا غیر روسی علاقے میں۔ یہ مسئلہ بظاہر غیر اہم معلوم ہوتا ہے لیکن فریقین کا اس پر اصرار اس کا پتہ دے رہا ہے کہ باہمی شکوک و شبہات کس قدر گہرے ہیں۔ آپس میں اعتماد کا فقدان یہاں تک پہنچ جائے تو حقیقی مسائل کے حل کی توقع ختم سمجھنی چاہئے۔ لیکن جہاں فریقین کے تصادم کی نوعیت یہ ہے کہ وہ کانفرنس کے مقام انعقاد پر اتفاق نہیں کرسکتے وہاں حالات کی رفتار ایسی ہے کہ وہ مجبور ہیں کہ گفتگوئے مصالحت کو جاری رکھیں عام اس سے کہ اس سے حاصل کچھ نہ ہو۔

برلن کانفرنس برلن کانفرنس دراصل سرد جنگ کی ایک اہم بازی ہوگی۔ یہ حقیقی مقصد میں تو کامیاب کیا ہوگی البتہ بین الاقوامی سیاست پر اس کا کافی اثر ہوگا۔ مغربی یورپ کے نزدیک سب سے اہم مسئلہ وحدت و استحکام کا ہے۔ لیکن اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ فرانس اور جرمنی کی دیرینہ مخاصمت ہے۔ امریکہ مغربی یورپ کی ایک مشترکہ فوج تیار کرنا چاہتا ہے تاکہ جرمنی کی اسلحہ بندی ہوسکے اور اسے (N.A.T.O) کے دفاعی منصوبے سے منسلک کیا جاسکے۔ یہ ظاہر ہے کہ جرمنی کی شرکت کے بغیر یورپ کا دفاع ناممکن ہے۔ لیکن فرانس کو ڈر ہے کہ اگر جرمنی مسلح ہوگیا تو اس کی ہستی معرض خطر میں پڑجائے گی۔ روس ان دفاعی انتظامات کو بنظر استحسان نہیں دیکھتا اور اس کی انتہائی کوشش ہے کہ اگر یہ بالکل درہم برہم نہ ہوسکیں تو کم از کم ملتوی ضرور ہوتے جائیں۔ چنانچہ اب روس اور امریکہ میں یہ نئی "جنگ" شروع ہوگئی ہے۔ امریکہ مغربی یورپ کو متحد کرکے روس کے خلاف محاذ مضبوط کرنا چاہتا ہے اور روس ان منصوبوں کو خاک میں ملانا چاہتا ہے، اس کیلئے روس، فرانس اور جرمنی کی دیرینہ مخاصمت کا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ برلن کانفرنس کو وہ اسی مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ یوں بھی وہ وقتاً فوقتاً جرمنی کی وحدت اور اس کے معاہدہ سے متعلق سبز باغ دکھاتا رہتا ہے

تاکہ اقوام مغرب اس فریب امن میں مبتلا رہیں اور دفاع سے بھی غافل ہو جائیں اور ایک دوسرے سے دور بھی ہوتی جائیں لیکن امریکہ کو اب یقین ہو چکا ہے کہ روس کبھی بھی وحدت جرمنی کی خاطر مشرقی جرمنی کو اپنے ہاتھ سے ضائع نہیں کریگا، لہٰذا امریکہ اس نیت سے برلن کانفرنس میں شریک ہو رہا ہے کہ اپنے حلیفوں پر یہ حقیقت بخوبی روشن کر دے کہ روس نہ جرمنی کی وحدت دل سے چاہتا ہے اور نہ معاہدہ امن کا متمنی ہے۔ امریکہ اپنے ساتھیوں کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا تو مغربی یورپ کی دفاع آسان ہو جائیگی۔ روس کے پاس فرانس کو زیر نگانے کا ایک اور حربہ بھی ہے اور یہ ہے ہند چینی۔ فرانس اس جنگ سے عاجز آچکا ہے اور اسے ختم کر دینا چاہتا ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں اس کی طرف سے ویٹ منھ کے قائد ڈاکٹر ہو کو یہ پیشکش کی گئی تھی کہ وہ اپنی شرائط پیش کرے۔ ہو چی منھ نے بھی جواباً صلح پر آمادگی کا اظہار کیا لیکن اپنی طرف سے شرائط صلح پیش نہیں کیں۔ یہ بات تو اس سے آگے نہ بڑھی لیکن کچھ دنوں کے بعد ویٹ منھ نے ہند چینی کی ایک سٹیٹ لاؤس پر اچانک حملہ کر کے اسے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور تھاخک جیسی جگہ پر قبضہ کر لیا جو ہند چینی اور آسام کی سرحد پر واقع ہے۔ اس سے ویٹ منھ کے آئندہ فوجی عزائم کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن قیاس غالب یہی ہے کہ یہ مذاکرات صلح کی "تیاری" ہے۔ اشتراکی فوجیں اپنی پوزیشن مستحکم کر رہی ہیں تاکہ اس دکھاوے سے امن کے معاہدہ میں زیادہ سے زیادہ شرائط منوائی جا سکیں۔ اس اقدام میں فرانس کو سخت شکست اٹھانا پڑی ہے اور کافی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ روس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ برلن کانفرنس میں فرانس کو یہ لالچ بھی دیگا کہ وہ ہند چینی میں صلح سے متعلق گفتگو بھی کر سکتا ہے بشرطیکہ اس گفتگو میں اشتراکی چین کو دعوت شرکت دی جا سکے۔ فرانس اس جنگ سے قریباً عاجز آچکا ہے اور اس کی تمام آبادی اسے ختم کرنے کیلئے بے چین ہے اسلئے فرانس ایسے لالچ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ روس کی یہ بھی کوشش ہے کہ اس طرح مغربی اتحادیوں میں نفاق پیدا ہو جائے تو فرانس کو ان سے علیحدہ کر کے اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔ دونوں میں قدر مشترک جرمنی کا ڈر ہے۔ گو یہ امکان فی الحال بعید از قیاس نظر آتا ہے لیکن بالکل خارج از بحث نہیں اندریں حالات برلن کانفرنس کو بین الاقوامی سیاست میں کافی اہمیت دی جا رہی ہے اور دلچسپی سے اسکو نگاہ میں رکھا جا رہا ہے۔

مشرق وسطیٰ کا ہیجان

"مشرق و مغرب" کی کشمکش کا اثر مشرق وسطیٰ اور دیگر ایشیائی ممالک کی سیاست پر شدت سے پڑ رہا ہے اور ممالک خوابیدہ و پسماندہ اپنے اندر حرکت و عمل کی نئی تڑپ محسوس کر رہے ہیں۔ ہر چند یہ حرکت بیرونی قوی کی بدولت ہے کسی اندرونی زندگی کی آئینہ دار نہیں تاہم تھوڑے سے تدبر سے ایک خاص منزل کی طرف اس کا رخ موڑا جا سکتا ہے۔ اسوقت ان خطوں کی تمام قوموں کے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ اس عالمگیر کشمکش میں ان کا مقام کیا ہو۔ ان کا یہ فیصلہ عناصر مختلفہ کے عمل و ردعمل کے باعث بڑا پیچیدہ ہو گیا ہے۔ جنگ عظیم کے پیشتر ان علاقوں میں برطانیہ کا اثر و دخل زیادہ تھا۔ بلکہ کئی ممالک تو براہ راست اسکے قبضہ میں تھے۔ جنگ کے بعد ایک تو برطانیہ ان مقبوضات سے بے دخل ہو گیا، دوسرے امریکہ کا اثر ان علاقوں میں بڑھنا شروع ہو گیا۔ اس سے انگلستانی امریکی نزاع کی ابتدا ہوئی۔ برطانیہ بدلے ہوئے حالات کے مطابق ان علاقوں پر اپنا اثر قائم رکھنا چاہتا ہے کیونکہ سیاسی طور پر ان سے بے تعلق ہو کر وہ معاشی اور تجارتی تعلقات برقرار رکھ سکتا ہے اور بیش بہا فوائد حاصل کر سکتا ہے۔ اسے اپنے ان حقوق کا تحفظ اس لئے بھی مقصود ہے کہ امریکہ کے سیاسی اثر کے ساتھ ساتھ جرمنی اور جاپان کی طرف سے تجارتی مقابلہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ برطانیہ ان دو تاجر ملکوں کا حریف نہیں ہو سکتا۔ اسلئے وہ دولت مشترکہ وغیرہ کے بہانے تراش تراش کر اپنے مفاد تجارت کا تحفظ کر رہا ہے۔ اس کے برعکس امریکہ اشتراکیت کے خلاف عالمگیر محاذ قائم کر رہا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے حلیف ممالک کسی بدامنی کا شکار ہوں، بلکہ کامل یکسوئی سے محاذ مطلوبہ کے قیام و استحکام میں مصروف ہو جائیں۔ اس کشمکش باہمی کا نتیجہ ہے کہ مشرق وسطیٰ اور ایشیا میں ہیجان عظیم پایا جاتا ہے۔ اس کا اثر امریکہ کے دفاعی منصوبوں پر

بھی پڑ رہا ہے۔ امریکہ نے شمالی اوقیانوسی ممالک کو یکجا کیا اور N.A.T.O. کی تشکیل کی۔ اس میں بعد میں ترکی اور یونان کو شریک کرکے اس منصوبہ کا دائرہ بحیرہ روم کے سواحل تک وسیع کردیا۔ وہ اس کا سلسلہ M.E.D.O. یعنی مشرقِ وسطیٰ کے دفاعی نظام سے منسلک کرکے اسے درجہ بدرجہ خلیج فارس، بحرِ ہند اور بحرالکاہل کے دفاعی منصوبوں سے ملا دینا چاہتا ہے۔ برطانیہ اپنے اثر و رسوخ کو برقرار رکھنے کیلئے امریکہ کے منصوبوں میں مزاحم ہو رہا ہے۔ چنانچہ میڈو کا منصوبہ ابھی تک معرضِ وجود میں نہیں آسکا، کیونکہ مصر اس میں اسوقت شرکت کریگا جبکہ برطانیہ نہر سویز کے علاقے سے اپنی فوجیں واپس بلائیگا اور برطانیہ اس کیلئے تیار نہیں۔ امریکہ ابتک ان موانعات کو راستے سے ہٹا نہیں سکا۔ اس وقت ترکی کلیتہً امریکہ کے ساتھ ہے اور اس کا معتمد علیہ ہے۔ امریکہ اس کی وساطت سے مشرقِ وسطیٰ اور ایشیا میں بڑھنا چاہتا ہے چنانچہ پچھلے دنوں یہ تجویز سامنے آئی کہ ترکی، عراق، ایران اور پاکستان کو ایک دفاعی نظام میں منسلک کیا جائیگا۔ اس خبر کو مزید تقویت اس امر سے بھی ملی کہ شاہ عراق اسی ماہ میں پاکستان آرہے تھے۔ نیز ترکی کے صدر کو بھی پاکستان آنا ہے۔ لیکن شاہ عراق کے دورہ کے التواء نے بعض خدشات کو حقیقی بنادیا۔ عراق برطانیہ کے حلقہ اثر میں ہے۔ اس میں ابھی تک برطانوی فوجیں مقیم ہیں۔ کیا اس التواء میں برطانیہ کا ہاتھ ہے؟ قرائن و آثار سے ایسے سوالات کا پیدا ہونا بالکل قابلِ فہم ہے۔

وحدتِ عربیہ

اس التواء کے ساتھ یہ خبریں دلچسپی سے خالی نہیں کہ عرب ممالک میں وحدتِ عربیہ کا تصور پیدا ہو رہا ہے اور عرب لیگ ان چھ عربی ممالک کے وفاق پر غور کررہی ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ وفاق کی تجویز بھی عراق نے پیش کی ہے۔ وزیرِ اعظم عراق نے یہاں تک کہا ہے کہ اگر تمام اقوامِ عرب کا اس میں شامل ہونا فوری طور پر ممکن نہ ہو تو وفاق دو تین ارکان سے بھی شروع کیا جاسکتا ہے۔ اس تجویز کا مفہوم یہ ہے کہ امورِ خارجیہ، مالیات، معاشیات، دفاع، تعلیم وغیرہ معاملات ایک مرکز کے سپرد کردیئے جائیں۔ اور بیرونی ممالک میں عربوں کا صرف ایک ہی نمائندہ ہو، یعنی ہر عربی قوم اپنا نمائندہ علیحدہ مقرر نہ کرے۔ اس تجویز کو خصوصیت سے مصر نے سراہا ہے۔ یہ دوسرا اتفاق ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ مصر نے حال ہی میں غیر جانبداری کا نعرہ بھی بلند کیا ہے، یعنی روس اور امریکہ کی کشمکش میں اس نے کسی ایک فریق کا ساتھ نہ دینے کا رجحان ظاہر کیا ہے۔ اور یہ تیسرا اتفاق ہے کہ مصر کا یہ رجحان ایسے وقت ظاہر ہوا ہے جبکہ ہندوستان امریکہ اور پاکستان کے مجوزہ معاہدہ کے سلسلہ میں خصوصیت سے "غیر جانبداری" کا مظاہرہ کررہا ہے۔ ہندوستان اس معاہدہ کی مخالفت "غیر جانبداری" کے زور پر ہی کرسکتا ہے۔ اور وہ مخالفت اسلئے کررہا ہے کہ پاکستان مضبوط ہوگیا تو اسے ہضم کرنا اس کیلئے آسان نہیں رہیگا۔ اسی طرح برطانیہ بھی اس معاہدہ پر مضطرب ہے۔ اس کے اضطراب کی علت یہ ہے کہ پاکستان میں اسکا اثر و دخل ختم ہو جائیگا۔ اس مخالفت میں ہندوستان اور برطانیہ دونوں یک زبان ہیں۔ ہندوستان عرصے سے مصر پر ڈورے ڈال رہا ہے تاکہ پاکستان مسلمان ممالک سے رشتہ مودت استوار نہ کرسکے۔ مصر میں ہندوستان کا بڑا شاطر سیاستدان، سردار پانیکر متعین ہے۔ وہ بظاہر اپنے مشن میں کامیاب ہوچکا ہے کیونکہ اسے عنقریب وہاں سے منتقل کیا جارہا ہے۔ امریکہ کی پوزیشن مشرقِ وسطیٰ میں عجیب ہے۔ وہ اعلانیہ برطانیہ کی مخالفت نہیں کرتا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ باوجود خواہش وہ ایران اور سویز کے قضیے حل نہیں کراسکا۔ اس سے امریکہ بدنام ہوگیا ہے کہ وہ برطانیہ کی استعماریت کی سرپرستی کررہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ کھل کر اس میدان میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ اس سے برطانیہ کو لمبی رسی میسر آگئی ہے۔ برطانیہ ایک طرف ایران اور مصر میں قدم جمائے ہوئے ہے، دوسری طرف وہ عربوں کا ہمدرد بن کر انھیں وفاق کا خواب دکھا رہا ہے۔ اس طرح ہندوستان اور برطانیہ کی کوشش یہ ہے کہ عربوں کو متحد کرکے ایک بلاک کا ملاک ہی پاکستان اور امریکہ سے علیحدہ کرلیا جائے۔ اس پس منظر میں مصر کا رجحان غیر جانبداری اور شاہ عراق کے دورہ پاکستان کے التواء کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ ہندوستان اس وحدت کے فریب سے مشرقِ وسطیٰ میں بھی دخیل ہو رہا ہے اور افریقی معاملات میں بھی اثر و رسوخ بڑھا رہا ہے۔ یہاں پھر وہ مصر کو آلۂ کار بنانا چاہتا ہے۔ افریقہ کے گوشے گوشے میں اسوقت جو جنگیں لڑی جارہی ہیں، انھیں ایک مرکز سے وابستہ کرنے کے منصوبے ہو رہے ہیں۔ یہ مرکز مصر میں ہوگا۔ گویا مصر افریقی نیشنلزم کا

قائد ہوگا۔ اس قیادت میں ہندوستان حصہ دار ہوگا۔ اس کے ساتھ افریقی نیشنلزم کا سلسلہ ایشیائی نیشنلزم سے ملا یا جائیگا اور ہندوستانی قیادت کا رخ ادھر موڑ دیا جائیگا۔ گویا برطانیہ اور ہندوستان اپنے اپنے مفاد کی خاطر اقوام افریقہ، مشرق وسطیٰ اور ایشیا کو ایک مرکز پر لا رہے ہیں تاکہ اپنی قیادت اقوام غالب سے تسلیم کرائیں۔ وہ ان اغراض کیلئے مصر کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ مصر کس حد تک ان کے مقاصد مشؤمہ کا آلہ کار بنے گا۔ اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اتنا یقینی ہے کہ اگر مصر نے ان شاطرانہ چالوں کو سمجھنے کی کوشش نہ کی تو عالم اسلامی کیلئے ایک خطرناک فتنہ کھڑا ہو جائے گا۔

مصر کا خلفشار

مصر کے اندرونی حالات کا تقاضا بھی ہے کہ وہ ان شاطرانہ چالوں سے بچ کر رہے۔ اسے اندرونِ ملک زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ابھی حال ہی میں اسے پھر سے ایک داخلی ہنگامے کا شکار ہونا پڑا ہے۔ جنرل نجیب کی فوجی حکومت نے مصری پارٹی اخوان المسلمون کو خلاف قانون قرار دیتے ہوئے کم و بیش ایک ہزار قائدینِ جماعت کو گرفتار کر لیا ہے۔ ان پر الزام یہ ہے کہ انھوں نے برطانیہ سے مل کر موجودہ حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی۔ مصر سے ابھی تک مفصل اطلاعات نہیں آئیں۔ اسلئے وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ تعجب کی بات ہے کہ اخوان المسلمون برطانیہ کی مخالفت میں پیش پیش تھی۔ نیز گذشتہ اکتوبر میں جب جنرل نجیب کی حکومت نے تمام سیاسی جماعتوں کو ختم کر دیا تھا تو اخوان المسلمون کو بدیں وجہ چھوڑ دیا گیا تھا کہ یہ مذہبی جماعت ہے۔ سیاسی نہیں۔ لیکن اب یہ جماعت بھی خلاف قانون قرار دیدی گئی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ موجودہ حکومت اپنے آپ کو اسقدر مضبوط سمجھتی ہے کہ وہ ایسی جماعت کے خلاف بھی کارروائی کر سکتی ہے اور یہ بھی کہ ہنوز یہ حکومت اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتی اور حالات تسلی بخش نہیں ہیں۔ جہاں تک "اخوان المسلمین" کا تعلق ہے وہ مذہبی جنون کی مظہر ہے جو ملی یا عمومی مفاد کو حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے۔ ایسی جماعتیں خواہ مصر میں ہوں، خواہ ترکی میں، خواہ پاکستان میں، خواہ انڈونیشیا میں، وہ جنون، نفرت اور ملکی تقاضوں سے بے رحمانہ لاپرواہی کا ہی مظاہرہ کریں گی۔ تدبر اور معاملہ فہمی کی توقع ان سے عبث ہے۔ یہ "مذہبی" ذہنیت کا خاصہ ہے کہ یہ بیج جس سرزمین میں بھی بویا جائے گا اس کا پھل یکساں طور پر خبیث ہوگا۔ طیب پھل تو صرف دین کے شجرِ بلند کا ہوتا ہے جس کے پیشِ نظر نوعِ انسانی کی بہبودی ہوتی ہے۔

سوڈان کا نیا دور

نہر سویز سے متعلق انگلستانی مصری مذاکرات پہلے کی طرح کھٹائی میں پڑے ہیں، گو اس دوران میں پھر ایسی خبریں آئیں کہ خاطر خواہ تصفیہ کی توقع ہے۔ اس خوش فہمی کی بظاہر کوئی وجہ نہیں۔ سوڈان میں البتہ ایک قدم اور اٹھایا گیا ہے اور وہاں نئے دور کا آغاز ہو گیا ہے۔ نئے عبوری آئین کے مطابق "خود مختاری" کی طرح ڈال دی گئی ہے۔ پارلیمان کے دو ایوان ہیں۔ ایک ایوانِ نمائندگان (۹۷۔ ارکان) اور دوسرا ایوانِ اعلیٰ (سینیٹ) (۵۰۔ ارکان ۔۔ ۳۰ منتخب اور ۲۰ گورنر جنرل کی طرف سے نامزد) ان کا افتتاح یکم جنوری کو ہوا۔ وزارت بھی مرتب کر لی گئی ہے۔ یہ دورِ حکومت برطانوی گورنر جنرل کی "قیادت" میں ہوگا اور اس گورنر جنرل کے چند خصوصی اختیارات ہوں گے جنھیں وہ ایک مجلس مشاورت کے استصواب کے مطابق استعمال کریگا۔ اس مجلس کے عناصرِ ترکیب یہ ہیں۔ ایک پاکستانی (صدر) دو سوڈانی، ایک برطانوی اور ایک مصری۔ گورنر جنرل برطانیہ اور مصر دونوں کے سامنے جوابدہ ہوگا اور جہاں اس میں اور مجلس میں اختلاف ہوگا وہ معاملہ بھی انہی دو حکومتوں کے سامنے پیش ہوگا۔ یہ عبوری آئین برطانوی مصری معاہدہ کی رو سے منظور ہوا تھا جو ۱۲ فروری ۱۹۵۳ء کو طے ہوا تھا۔ اس کے مطابق ایک اور کمیشن کی بھی تشکیل ہوگی جس میں ایک برطانوی، ایک مصری اور تین سوڈانی نمائندے ہوں گے۔ یہ حکومت، پولیس، فوج اور دیگر ایسے اداروں کو جو خود ارادیت کیلئے ضروری ہوں "سوڈانی" بنائے گی۔ اس آئین کی میعاد تین سال کی ہے۔ اس دوران میں کسی وقت سوڈانی پارلیمان یہ قرارداد منظور کرے گی کہ اب خود ارادیت کے لئے انتظامات شروع کر دیئے جائیں

اس کے بعد ایک مجلس دستور ساز مرتب ہوگی جو یہ فیصلہ کریگی کہ سوڈان کو آزاد ہونا چاہئے یا مصر سے الحاق کرنا چاہئے۔ وہ مجلس اس فیصلے کے مطابق اپنا آئین بھی مرتب کریگی۔ فیصلے سے پہلے برطانیہ اس پر مصر تھا کہ سوڈانیوں کو دولت مشترکہ میں شرکت کی بھی اجازت ہونی چاہئے لیکن مصر کی کوششوں سے یہ شق مسترد ہوگئی اور اب سوڈان کے سامنے دو صورتیں ہیں یعنی آزادی یا مصر سے الحاق۔

ایشیا کی بساط

جو کچھ مشرق بعید میں پاکستان کے خلاف ہو رہا ہے وہی کچھ ایشیا میں ہو رہا ہے۔ پاکستان کے مزعومہ فوجی استحکام کے خلاف تو ہندوستان بہت پیچ و تاب کھا رہا ہے لیکن وہ چین کے ان جنگی استحکامات کے خلاف ذرا بھی احتجاج نہیں کرتا جو تبت میں ہندوستان کی سرحدوں کے ساتھ کئے جا رہے ہیں۔ حالانکہ ہندوستان کا یہ خدشہ کہ پاکستان کے اقدامات سے ایشیا میں توازن قوی بدل جائے گا چین نے حقیقی بنا دیا ہے۔ توازن قوی تو چین کے اشتراکی ہوتے ہی درہم برہم ہو گیا تھا۔ ہندوستان سیلون، برما اور انڈونیشیا کو اپنے ساتھ ملا رہا ہے اور سب کو پاکستان کے خلاف تیار کر رہا ہے۔ لیکن ابھی یہ ممالک اس کے فریب میں نہیں آئے۔ حالانکہ ان میں سے بعض "غیر جانبداری" کے خواب ضرور دیکھ رہے تھے اور ہندوستان اسے اپنی فتح سمجھتا تھا۔ پچھلے دنوں پنڈت نہرو نے امور خارجہ سے متعلق پارلیمان میں جو تقریر کی اس میں بہت سا وقت پاکستان کو دیا۔ اس میں انھوں نے یہ کہا کہ سیلون، برما، انڈونیشیا اور دیگر ایشیائی ممالک مجوزہ پاکستانی امریکی فوجی امداد کے خلاف ہیں۔ اسکی قریباً سب نے تردید کی۔ کراچی میں مقیم تمام متعلقہ سفیروں نے غیر مبہم طور پر کہہ دیا کہ ان کی حکومتوں نے انھیں اس معاہدہ کی مخالفت کیلئے کسی قسم کی کوئی ہدایات نہیں بھیجیں اور نہ انھوں نے اس کی مخالفت ہی کی ہے۔ بظاہر اس کی مخالفت کی کوئی وجہ نظر بھی نہیں آتی۔ برما کا دفاعی معاہدہ برطانیہ سے ہے۔ اس کی میعاد ختم ہو رہی ہے لیکن وہ برطانیہ سے نئے معاہدہ کے لئے گفتگو کر رہا ہے۔ بعض مبصرین کا خیال ہے کہ اگر برطانیہ سے معاہدہ نہ ہو سکا تو برما امریکہ سے مدد کا طلبگار ہوگا۔ یہ بالکل قابل فہم ہے۔ برما بغیر اس قسم کی امداد کے اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ جب وہ اوروں سے مدد لے رہا ہے تو وہ پاکستان کی مدد طلبی پر کیسے معترض ہو سکتا ہے؟ سیلون کو بھی اسی طرح مدد کی ضرورت ہے جبکہ اسے تو اپنے آپ کو ہندوستان سے محفوظ رکھنا ہے۔ وہ بدقسمتی سے ہندوستان کا حصہ رہ چکا ہے اور ہندوستان کی اس پر نظر ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی حدود میں لاکھوں ہندوستانی آباد ہیں جو آئے دن وہاں فتنے پیدا کرتے رہتے ہیں تاکہ سیلون میں "ہندوستانی مسئلہ" پیدا ہو جائے اور ہندوستان کو سیلون کے معاملات میں دخیل ہونے کا بہانہ مل جائے۔ ان حالات میں سیلون ہندوستان کا ساتھ بخوشی نہیں دیگا کیونکہ اس میں اس کے مٹ جانے کے امکان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دولت مشترکہ میں بدستور شریک ہے اور ایک نوآبادی کی حیثیت سے جا رہا ہے۔ حال ہی میں سیلونی وزیر اعظم پاکستان آئے اس آمد سے پیشتر انھوں نے پاکستان، ہندوستان، برما اور انڈونیشیا کے وزرائے اعظم کو ایک دعوت ارسال کی کہ وہ سب مل کر بعض مشترکہ مسائل پر غور کریں۔ پنڈت نہرو نے اس دعوت کا بھی فائدہ اٹھانا چاہا اور کہنا شروع کر دیا کہ کانفرنس پاکستانی امریکی امداد کے خلاف طلب کی جا رہی ہے۔ سیلون کے وزیر اعظم نے اس کی تردید کر دی اور بتایا کہ ان کے پیش نظر یقیناً یہ چیز نہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جس کانفرنس میں پنڈت نہرو اس ذہنیت کے ساتھ شریک ہوں گے۔ اس کا انجام کیا ہوگا۔

برطانیہ اور پاکستان

برطانیہ کا رویہ اس مدد کے سلسلہ میں عجیب ہے۔ وہ ہندوستان کا ہمنوا ہے اور یہ نہیں چاہتا کہ پاکستان امریکہ سے استمداد کرے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو پاکستان کا رخ امریکہ کی طرف موڑنے کے ذمہ دار یہی دو ملک ہیں۔ اگر یہ پاکستان کے حقوق کی رعایت ملحوظ رکھتے اور طرح طرح کی رکاوٹیں ڈال کر پاکستان کو بددل نہ کرتے تو شاید آج یہ صورت پیش نہ آتی۔ برطانیہ نے دولت مشترکہ

کی آڑ لیکر امداد کی مخالفت کی حالانکہ برطانیہ خود امریکہ سے مدد لے رہا ہے۔ بلکہ جنگ کے بعد وہ امریکی امداد کے آسرے پر ہی جی رہا ہے۔ اس نے محض معاشی مدد ہی نہیں لی بلکہ فوجی مدد بھی لی اور امریکہ کو اپنے اڈے بھی دے رکھے ہیں۔ ان معاہدات میں برطانیہ نے دولت مشترکہ سے استصواب ضروری نہیں سمجھا۔ نہ دولت مشترکہ کی رکنیت اس کے راستے میں حائل ہوئی۔ اسی طرح دولت مشترکہ کے دو اہم ارکان آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ امریکہ سے دفاعی معاہدہ کر چکے ہیں۔ اس معاہدے میں برطانیہ بھی شریک نہیں اور نہ اس سے مشورہ ہی لیا گیا تھا۔ برطانیہ اس پر کبھی معترض نہیں ہوا۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر پاکستان پر ہی نکتہ چینی کیوں ہو رہی ہے؟ اگر دولت مشترکہ کی رکنیت کا مطلب یہ ہے کہ ارکان ایک دوسرے کے مشورے سے کام کریں تو جب پاکستان کو دولت مشترکہ کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ اس کے کام کیوں نہیں آتی؟ کشمیر کے معاملہ میں دولت مشترکہ کا رویہ ایک تماشائی کا سا رہا ہے۔ کیا اتنا شدید خطرہ دولت مشترکہ کے لئے مفید ہو سکتا ہے؟ نہیں ہو سکتا تو اس کے حل کیلئے کیا کیا گیا؟ ایک مرتبہ وزرائے اعظم کی کانفرنس لندن میں ہونے والی تھی تو مرحوم لیاقت علی خاں نے یہ شرط لگائی تھی کہ اس میں کشمیر کو بھی زیر بحث لایا جائے۔ اس کی ہندوستان نے مخالفت کی تھی اور برطانیہ نے بھی اسے قبول نہیں کیا تھا۔ اور جب لندن میں اس مسئلہ کو زیر بحث لایا گیا تو دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی عام کانفرنس میں نہیں بلکہ نجی طور پر کیا گیا تھا۔ اس وقت اعتراض یہ کیا گیا تھا کہ دولت مشترکہ ایسے نزاعی مسائل میں حصہ نہیں لے سکتی۔ اسی طرح ایک موقع پر مرحوم لیاقت علی نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ دولت مشترکہ پاکستانی سرحدات کے تحفظ کی ضمانت دے تو اس تجویز کو بھی قابل عمل نہیں سمجھا گیا تھا۔ تو اب پاکستان یہ پوچھ سکتا ہے کہ جو دولت مشترکہ اس کے مسائل حل نہیں کر سکتی وہ اس کے راستے میں مزاحم کیوں ہوتی ہے؟ نیز یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ دولت مشترکہ سے استصواب کا مطلب کیا ہے؟ کیا یہ کہ ارکان دولت امور خارجہ میں آزادانہ لائحہ عمل اختیار نہیں کر سکتے؟ آج تک ایسا کسی نے نہیں کہا بلکہ یہی کہا جاتا رہا ہے کہ جملہ ارکان اپنے اپنے معاملات میں بالکل آزاد و خود مختار ہیں۔ اگر دولت مشترکہ کی رکنیت ان کی آزادی عمل پر کوئی حد عائد کرتی ہے تو کئی ارکان اسے قبول نہیں کریں گے۔ خود پاکستان اس رکنیت کیلئے تیار نہیں ہوگا۔ نیز یہ امر نہ برطانیہ کو فراموش کرنا چاہئے نہ ہندوستان کو کہ پاکستان مضبوط و مستحکم ہوگا تو اس سے دولت مشترکہ کی مجموعی قوت میں اضافہ ہوگا۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ پاکستان امریکہ سے مدد طلب کر رہا ہے جو برطانیہ کا حلیف ہے نہ کہ اس کا مخالف۔ دراصل یہ ساری کوششیں اسلئے ہو رہی ہیں کہ پاکستان کمزور رہے اور ان کے رحم و کرم پر۔

پنڈت نہرو کا محاذ

جہاں تک پنڈت نہرو کا تعلق ہے انہیں سیلون کے معاملہ میں کافی زک اٹھانا پڑی ہے۔ وزیر اعظم سیلون نے کراچی میں بھی اس کی وضاحت کی کہ وہ جو کانفرنس بلا رہے ہیں اس کا اس امداد سے کوئی تعلق نہیں۔ گویا پنڈت نہرو جو محاذ ایشیا میں قائم کر رہے ہیں وہ بھی کامیاب نہیں ہو رہا۔ انہی دنوں وزیر اعظم پاکستان نے مشرقی پاکستان کے دورے کے دوران میں ہندوستان کے متعلق بات کرتے ہوئے کہا کہ وہ مشرق و مغرب کی کشمکش میں توازن قائم کرنے کیلئے ایشیائی ممالک کی قیادت کرنا چاہتے ہیں اور اسی لئے پاکستان کو کمزور دیکھنے کے متمنی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی وضاحت کی کہ گو امریکہ کو فوجی اڈے دینے کا سوال خارج از بحث ہے لیکن اگر کوئی افتاد آ پڑے تو پاکستان کو آزاد ملک کی حیثیت سے یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوست ملک کو دعوت دے اور اس کی مدد سے اپنے آپ کو دشمنوں کے ضرر رسانی سے بچائے۔

لسانی استصواب

مشرقی پاکستان کے دورے میں جہاں امریکی امداد کے مسئلے کو اور صاف کر دیا گیا وہاں ملی مسائل کو اور الجھا دیا گیا۔ ایک جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے وزیر اعظم صاحب نے لسانی مسئلہ کو چھیڑا اور یہاں تک کہہ گئے کہ اگر اہل بنگال اردو کے علاوہ اپنی

زبان کو بھی قومی زبان بنانا چاہیں گے تو وہ ان کی حمایت کرینگے اور خود اس مسئلہ کو مجلس دستور ساز میں پیش کریں گے۔ بنگال کے ماحول میں اس کا مفہوم ایک ہی لیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ وزیر اعظم صاحب نے بنگلہ کو سرکاری زبان بنانے کا "فیصلہ" کر دیا ہے۔ اس کا اور نتیجہ بھی نکلے یہ ضرور ہوگا کہ بنگال کی فضا میں لسانی تعصب اور زور پکڑ جائیگا۔ لیکن بدقسمتی سے اس نزاع کو یہیں تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھا دیا گیا۔ وزیر اعظم کے بیان پر مولوی عبدالحق صاحب نے نکتہ چینی کی اور لگے ہاتھ یہ تجویز پیش کر دی کہ زبان کا معاملہ بذریعہ استصواب طے کیا جائے۔ وزیر اعظم صاحب کو یہ "جمہوری" تجویز بہت پسند آئی اور انھوں نے اسے فوراً قبول کر لیا۔ گویا، اگر اس تجویز کو آگے بڑھایا گیا تو ملک بھر میں یہ استصواب ہوگا کہ ملک کی زبان تنہا اردو ہو یا اردو اور بنگالی دونوں۔ اور اس طرح صوبائیت کا جو زہر مشرقی پاکستان میں پھیلایا جا رہا ہے اس سے تمام جسد پاکستان کو مسموم کیا جائے گا۔ تعجب ہے ان قائدین پر کہ اس انتخاب کی مہم میں وہ رائے دہندوں سے اپیلیں کر رہے ہیں کہ قائد اعظم کی یادگار ــــ مسلم لیگ ــــ کے نام پر ووٹ دیجئے اور ان کے حکم سے سرتابی نہ کیجئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قائدین خود زبان کے مسئلے میں قائد اعظم کے فرمان کی صریح خلاف ورزی کے مرتکب ہو رہے ہیں! اگر اس حقیقت کو نظر انداز بھی کر دیا جائے کہ تحریک پاکستان کے دوران میں یہ مسلمہ تھا کہ پاکستان میں نظام حکومت اسلامی ہوگا اور زبان اردو، تو اس سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ اسی ڈھاکہ میں جہاں آج وزیر اعظم لسانی استصواب کے گیت گا رہے ہیں، قائد اعظم نے فرمایا تھا کہ پاکستان کی زبان ایک ہوگی اور وہ اردو ہے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اردو کے مقابلے میں جو لوگ بنگلہ کو پیش کر رہے ہیں وہ پاکستان کے دشمن ہیں۔ آج قائد کے نام پر ووٹ طلب کرنے والے قائد کے فرمانوں کو پوری ڈھٹائی سے پس پشت ڈال رہے ہیں۔

مسلم لیگ کی سیاست

وزیر اعظم بہ حیثیت صدر مسلم لیگ جو فیصلے فرما رہے ہیں ان کے جلو میں بھی کئی فتنے ہیں۔ یوں تو مسلم لیگ مردہ اور متعفن جماعت ہے لیکن جس طریق سے اس تعفن اور سڑاند کو مشام جان کیلئے سرمایہ بنایا جا رہا ہے، اس سے ارباب حل وعقد کے دل و دماغ پر حیرت ہوتی ہے۔ اس کے سامنے نہ کوئی پروگرام ہے نہ نصب العین۔ حکومت کے زور پر اس کا نام "روشن" ہے اور بس یہی اس کی زندگی ہے۔ مشرقی پاکستان میں جس انداز کی انتخابی تقریریں ہو رہی ہیں، وہ اس کا ثبوت ہیں کہ مسلم لیگ اور مخالف جماعتوں میں نام کا فرق ہے۔ تمام حریف صوبائی مطالبات پر زور دینے میں ایک دوسرے کو مات کر رہے ہیں۔ پاکستانی مفادات کی نظروں سے اوجھل ہے۔ یہ عجیب تضاد ہے کہ تمام حریف اپنے مطالبات میں "متفق" ہیں۔ یہ اتفاق جمہوری احزاب سیاسی میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ مسلم لیگ کے پاس البتہ یہ دلیل زائد ہے کہ یہ جماعت قائد اعظم کی میراث ہے اور اسی نے پاکستان کو بنایا تھا۔ حالانکہ اسی حتم و یقین سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اسی جماعت نے پاکستان کو اس حال میں بھی پہنچایا ہے۔ مغربی پاکستان میں مسلم لیگ کی حالت بالکل دگرگوں ہے۔ بلوچستان میں اس کا وجود ہی نہیں۔ سندھ میں وزیروں نے متعدد مرتبہ کہا ہے کہ مسلم لیگ باقی نہیں اور یہ حقیقت بھی ہے۔ انتخابات سے پیشتر صدر پاکستان مسلم لیگ (خواجہ ناظم الدین) نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ مسٹر کھوڑو صوبہ مسلم لیگ کے آئینی صدر نہیں۔ مسٹر کھوڑو نے یہ فیصلہ تسلیم نہیں کیا اور صوبائی مسلم لیگ کو برقرار رکھا اور اسی کی طرف سے انتخابات لڑے۔ "اصلی" مسلم لیگ نے مرکز سے ایک انتخابی جماعت مقرر کر دی جس کی نگرانی میں انتخابی جنگ جیتی گئی۔ انتخابات کے بعد صوبے میں مسلم لیگ اگر ہے تو وہ مسٹر کھوڑو کی ہے لیکن اسے مرکزی مسلم لیگ تسلیم نہیں کر رہی۔ اس کی بجائے مرکز نے کوئی اور جماعت قائم نہیں کی۔ ذرا اس مذاق کو ملاحظہ کیجئے کہ سندھ میں مسلم لیگ کی حکومت ہے لیکن مسلم لیگ نہیں۔

پنجاب کی حالت قابل رحم ہے۔ وہاں مسلم لیگ موجود ہے لیکن اس نے اپنی حکومت کو ڈانواں ڈول کر رکھا ہے۔ گذشتہ سال مسٹر دولتانہ کی

وزارت ختم ہوئی تھی اسوقت خود دولتانہ صاحب نے ملک فیروز خاں نون کا نام تجویز کیا تھا چنانچہ نون وزارت قائم ہوگئی۔ پہلے تو دولتانہ صاحب ملک سے باہر چلے گئے تھے لیکن پھر لاہور پہنچکر اس کوشش میں مصروف ہوگئے کہ کھوئی ہوئی وزارت دوبارہ حاصل کریں۔ انھوں نے بڑی محنت اور کوشش سے عدم اعتماد کی قرارداد تیار کرائی جو مسلم لیگ اسمبلی پارٹی میں نون صاحب کے خلاف پیش کی گئی لیکن وہ مسترد ہوگئی۔ گویا "جمہوری" نقطۂ نگاہ سے ملک نون کو اکثریت کا اعتماد حاصل ہوگیا۔ لیکن دولتانہ پارٹی نے اس کو کافی نہ سمجھا۔ انھوں نے صوبائی مسلم لیگ میں رسہ کشی شروع کردی اور نون صاحب کے خلاف بحیثیت صدر مسلم لیگ عدم اعتماد کی تیاریاں شروع کردیں۔ یہ کچھ ہو رہا تھا کہ ایک صاحب نے معاملہ عدالت تک پہنچا دیا۔ ان کا مقدمہ یہ تھا کہ ملک صاحب آئینی طور پر مسلم لیگ کے صدر نہیں۔ اس مقدمہ کا فیصلہ تو ہوتا رہے گا لیکن عدالت نے ملک صاحب کے نام حکم امتناعی جاری کردیا ہے کہ وہ تا فیصلہ مقدمہ مسلم لیگ کی صدارت نہ کریں۔ اس سے دولتانہ صاحب کے عدم اعتماد کا مسئلہ دب گیا۔

صدر کے اقدامات

اب یہ معاملہ مرکز کے سپرد ہوا۔ دسمبر میں مرکزی مسلم لیگ مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا۔ یہ مجلس عاملہ نامکمل تھی مجلس عاملہ کا مسئلہ بھی خوب ہے۔ خواجہ ناظم الدین صاحب نے اپنے زمانے میں مجلس عاملہ نامزد ہی نہیں کی تھی کہ ان کی صدارت اور وزارت ختم ہوگئی۔ اس "نامکمل" مجلس عاملہ نے یہ فیصلہ کیا کہ پنجاب اور سندھ کی صوبائی لیگیں توڑ دی جائیں اور ان کو از سر نو منظم کیا جائے۔ اس فیصلے کی زد براہ راست مسٹر کھوڑو اور مسٹر دولتانہ پر پڑتی تھی۔ دونوں کو یہ خطرہ تھا کہ نئی تنظیم میں انھیں کم یا غیر موثر بنا دیا جائیگا۔ یہی خواہان مسلم لیگ کیلئے یہ فیصلہ پسندیدہ ہو سکتا تھا کیونکہ اس میں یہ گنجائش تھی کہ اس جسد مردہ میں پھر سے جان ڈالی جا سکے لیکن یہاں یہ مقصد کسی کے پیش نظر نہ تھا۔ ہر ایک کا عندیہ اپنی پوزیشن کا استحکام یا بہتر پوزیشن کا حصول تھا۔ چنانچہ اس فیصلے کی مخالفت شروع ہوگئی۔ مسٹر کھوڑو اور مسٹر دولتانہ نے اس فیصلہ کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا کیونکہ یہ "نامکمل" مجلس عاملہ کا فیصلہ تھا۔ مجلس عاملہ کے نمائندوں نے اسکے جواب میں یہ کہا کہ فیصلہ بجا اور آئینی ہے کیونکہ فیصلے کیلئے کورم پانچ ارکان کا مقرر ہے اور اتنے ارکان "نامکمل" مجلس عاملہ میں موجود تھے۔ بہرحال مخالفین نے اس فیصلے کو کونسل کے سامنے پیش کرنا چاہا اور اس کیلئے قاعدے کے مطابق کوئی ایک سو ارکان کونسل کی طرف سے ایک درخواست بھیجی کہ کونسل کا خصوصی اجلاس طلب کیا جائے۔ ہر چند یہ مسئلہ جماعت کا اندرونی مسئلہ تھا تاہم اسے خوب ہی بحث و نزاع کا محور بنایا گیا۔ مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری کے پاس جب یہ عرضداشت پہنچی تو انھوں نے اسے "خلاف ضابطہ" قرار دیا اور دلائل (اخباری بیان میں) اس طرح کے دیئے۔ ان میں بعض دستخط دوہرے ہیں اور بعض جعلی۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ سفید کاغذ پر دستخط لے لئے گئے اور بعد میں عرضی تیار کرکے اس کے ساتھ منسلک کردیئے گئے۔ گویا ہو سکتا ہے کہ دستخط کنندگان کو یہ معلوم بھی نہ ہو کہ وہ کونسل کے اجلاس کیلئے دستخط کر رہے ہیں۔ تعجب ہے کہ کسی دستخط کرنے والے نے اسکے متعلق کچھ نہ کہا اور سبھی منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ جماعتی دستور کے مطابق یا تو یہ عرضداشت غلط تھی یا صحیح۔ غلط ہونے کی صورت میں کسی قسم کی کارروائی خارج از بحث تھی۔ صحیح ہونے کی صورت میں صرف یہی چارۂ کار رہتا کہ اجلاس طلب کیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اس اثنا میں وزیر اعظم (یا صدر مسلم لیگ) ڈھاکہ تشریف لیگئے۔ وہاں سے ان کے ایک معتمد نے یہ اطلاع بھیجی کہ صدر صاحب بذات خود مجلس عاملہ کو "نامکمل" سمجھتے ہیں اور وہ اس کے فیصلے کو معرض التوا میں رکھیں گے تا آنکہ مکمل مجلس عاملہ (جو اب بن چکی ہے) ان کی تصدیق نہ کرلے۔ صدر صاحب اس کے متعلق خاموش رہے۔ پنجاب سے دوسرے روز یہ خبر آئی کہ جنرل سکریٹری پنجاب مسلم لیگ کے پاس صدر کے احکام پہنچ چکے ہیں کہ "نامکمل" مجلس عاملہ کے فیصلے پر تا حکم ثانی عمل نہ کیا جائے۔ اگلے روز انہی سکریٹری صاحب نے ایک بیان میں بتایا کہ انھوں نے اس مضمون کا کوئی بیان شائع نہیں کیا نیز ان کے

پاس صدر کے کوئی احکام نہیں پہنچے۔ صدر صاحب اب بھی خاموش تھے۔ وہ وزیر اعظم سیلون کے دورے کے سلسلہ میں کراچی آئے تو ۱۶ جنوری کو یہ بیان دیا کہ سندھ اور پنجاب لیگوں کے توڑنے کا فیصلہ مجلس عاملہ کے روبرو نظر ثانی کیلئے پیش کیا جائے گا اور اس کے بعد کونسل کے اجلاس کی ضرورت ہوئی تو طلب کیا جائیگا ورنہ نہیں، نیز انھوں نے مجلس عاملہ کا اجلاس یکم فروری کی بجائے ۱۰ مارچ تک ملتوی کر دیا۔ گویا مخالفین فیصلہ کے جن دلائل کو یہ لوگ رد کرتے رہے بالآخر انھیں کے سامنے انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ان حالات میں مسلم لیگ کی تنظیم کا جو حشر ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ نیز یہ بھی تصور کیا جا سکتا ہے کہ ایسی جماعت کی تنظیم نو کی جائیگی تو کیا صورت حال ہوگی۔ مزید برآں یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ایسی جماعت عوام میں کسقدر مقبول ہوگی۔ اس کا اندازہ تازہ مثال سے بھی ہو جائیگا۔ انہی دنوں کراچی کارپوریشن کے بقیہ سات وارڈوں کے انتخابات ہوئے ہیں۔ ان میں مسلم لیگ نے زیادہ نشستیں حاصل کی ہیں۔ اس سے مسلم لیگ کی مقبولیت کا دھوکہ ہوتا ہے۔ ارباب لیگ اس دھوکے میں مبتلا ہو کر اسے جماعت کی کامیابی کی دلیل قرار دے رہے ہیں لیکن وہ اس امر کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جہاں مسلم لیگ کے امیدوار ۲۵ تھے وہاں آزاد ۵۸ تھے یعنی لیگ سے دوگنے سے بھی زیادہ۔ لیگ کے مقابلہ میں کوئی سیاسی جماعت نہیں تھی۔ گویا اکثریت کا رجحان "آزادی" کی طرف ہو رہا ہے۔ حالانکہ چھ سال کے تجربے کے بعد امیدواروں کو کسی نہ کسی جماعت سے متعلق ہونا چاہیئے تھا۔ محض یہی نہیں بلکہ مسلم لیگ کے نامزدگان بھی بیشتر ذاتی اثر و رسوخ کی بنا پر کامیاب ہوئے ہیں۔ مسلم لیگ کے نام پر کامیابی کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ مسلم لیگ نے کراچی شہر کے لئے کوئی پروگرام منظور نہیں کیا تھا جسے ووٹر تسلیم کرتے اور اس کے حق میں ووٹ دیتے۔ چنانچہ ایسا نہ ہونے کی صورت میں کارپوریشن کے انتخاب کے سلسلہ میں نعرے یہ لگتے رہے کہ ہم کشمیر دلوائیں گے۔ نہ کسی امیدوار نے یہ بتانے کی زحمت گوارا کی اور نہ کسی رائے دینے والے نے یہ تقاضا کیا کہ یہ لوگ رکن بن کر کراچی شہر کی ضروریات، مثلاً پانی، صفائی، تعلیم، سڑکیں، طبی امداد وغیرہ کا کیا انتظام کریں گے۔ یہ ہے چھ سال کی "محنت" کا نتیجہ!

خان عبدالقیوم خاں کے مرکز میں وزیر بن جانے پر صوبہ سرحد میں داروگیر کی حکمت عملی میں جو خوش گوار تبدیلی واقع ہوئی تھی، اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ صوبہ سرحد کے تمام سیاسی نظر بند رہا کر دیئے گئے ہیں اور ان کی ضبط شدہ جائدادیں بھی واپس کر دی گئی ہیں۔ ڈاکٹر خان صاحب سابق وزیر اعلیٰ پر سے بھی تمام پابندیاں اٹھ گئی ہیں اور ان کے بھائی عبدالغفار خاں کو (مرکزی حکومت نے) راولپنڈی جیل سے رہا کر دیا ہے، گو ان پر ابھی پنجاب میں رہنے کی پابندی ہے۔ اس حکمت عملی کا اثر دوسرے صوبوں پر بھی پڑنا شروع ہو گیا ہے۔ بلوچستان میں خان عبدالصمد خاں کو پانچ سال کی نظر بندی کے بعد رہا کر دیا گیا ہے۔ پنجاب میں بعض علماء کو جو سیفٹی ایکٹ کی رو سے گذشتہ سال نظر بند کئے گئے تھے، رہا کر دیا گیا ہے اور دوسروں کی رہائی پر غور ہو رہا ہے۔ مشرقی پاکستان کے متعلق وزیر اعظم نے اعلان کیا ہے کہ وہاں بھی سیاسی نظر بند رہا کئے جائیں گے۔ اس صوبے میں غالباً سب سے زیادہ نظر بند ہیں اور احزاب مخالف مطالبہ کر رہی ہیں کہ انھیں جلد از جلد رہا کیا جائے۔ خدا کرے کہ اب ملک میں ایسی فضا پیدا ہو جائے جس سے افراد یا احزاب کے مفاد کے بجائے پاکستان کا مفاد کلی سب کا مقصود بن جائے اور ملت پاکستانیہ کے لئے آزادی کے ثمرات سے بہرہ یاب ہونے کی صورت پیدا ہو جائے۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است

ادارۂ طلوعِ اسلام کی مطبوعات ایک نظر میں

معراجِ انسانیت ترجمانِ حقیقت جناب پرویز کا قلم اور سیرت صاحبِ قرآن علیہ التحیۃ والسلام، خود قرآن کے آئینہ میں۔ جو اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ ابتدا میں تقریباً پونے دو سو صفحات پر دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرورِ کائنات جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریب نو سو صفحات۔ کاغذ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط وحسین گرد پوش مرصع ودیدہ زیب ٹائیٹل اور صحیح بہار کے عنوانات منقش ورنگیں قیمت بیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

نوادرات علامہ حافظ محمد اسلم صاحب کے نادر مضامین کا قابلِ قدر مجموعہ۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ قیمت صرف چار روپے (علاوہ محصولڈاک)

اسلامی نظام دورِ حاضر کی ایک بلند پایہ کتاب جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت کے نظام اور آئین کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ وہ نظام آج کس طرح قائم ہو سکتا ہے اس میں محترم پرویز صاحب اور علامہ محمد اسلم جیراجپوری کے وہ مقالات شامل ہیں جنھوں نے قوم کے سنجیدہ طبقہ کے سامنے فکر و نظر کی نئی راہیں کھولدی ہیں ضخامت ۱۸۴ صفحات مجلد مع گرد پوش۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصولڈاک)

قرآنی دستورِ پاکستان آئینی جدوجہد کے سلسلہ میں ادارۂ طلوعِ اسلام کی پیشکش قرآن کی روشنی میں مسودات قرارداد مقاصد بنیادی اصول وحقوق جو حکومت کے اعلان کے جواب میں بھیجے گئے۔ ساتھ ہی حکومت کی جانب سے پاس کردہ قرارداد مقاصد اور بنیادی اصولوں کی پہلی رپورٹ پر قرآن کی روشنی میں تنقید مولوی صاحبان کے بائیس نکات کا تجزیہ، اسلامی جماعت کی دستوری سفارشات پر تبصرہ ضخامت ۲۲۴ صفحات مجلد مع گرد پوش دو روپے آٹھ آنے

اسبابِ زوالِ امت (پہلا حصہ) دورِ حاضرہ کی انقلاب آفریں کتاب۔ مختصر مگر ہماری ہزار سالہ تاریخ کا نچوڑ جس نے قوم کے سنجیدہ تعلیمیافتہ طبقہ کے قلب ونگاہ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ صحیح طور پر بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور اس کا علاج کیا؟ ضخامت ۱۵۰ صفحاتِ مجلد طلائی گرد پوش قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

تین اہم عنوانات ملا کے مذہب کے عجیب وغریب حقائق مثلاً (۱) تبدیلِ مذہب کرنیوالوں کو قتل کر دیا جائیگا۔ (۲) غلام اور لونڈیاں بے حد و نہایت بلا نکاح حرم سراؤں کی زینت بنائی جا سکیں گی (۳) یتیم بچوں کو وراثت سے محروم رکھا جائے گا۔ قرآن کی روشنی میں ملا کے خود ساختہ مذہب کے ابطال اور تینوں کا حل اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے۔ ضخامت ۲۱۲ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

سلیم کے نام خطوط محترم پرویز صاحب کے قلم سے۔ ہمارے نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق جسقدر شکوک پیدا ہوتے ہیں ان کا نہایت شگفتہ شاداب اور سائنٹفک انداز میں تسلی بخش جواب۔ عقائد و نظریات جیسے خشک اور نازک مسائل پر اس عمدگی سے بحث کی گئی ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کسی خشک فلسفیانہ بحث کو پڑھ رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں وہ دقیق اور معرکہ آرا مسائل حل کر کے رکھ دیئے گئے ہیں جنھیں ضخیم مجلدات میں بھی حل نہیں کیا جا سکا تھا ضخامت بڑے سائز کے ۲۳۵ صفحات۔ مجلد مع حسین گرد پوش۔ قیمت چھ روپے (علاوہ محصولڈاک)

ہماری بصیرت کے مطابق قرآنی فیصلے دورِ حاضرہ کی ایک اہم کوشش جس میں روزمرہ زندگی کے تقریباً ساٹھ اہم مسائل ومعاملات کے متعلق قرآن کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان مسائل اور معاملات میں قرآن کا کیا فیصلہ ہے۔ یہ کتاب آپ کو دوسرے سہاروں سے بے نیاز کر دیگی ضخامت ۴۰۸ صفحات۔ قیمت مجلد مع گرد پوش چار روپے (علاوہ محصولڈاک)

جشن نامے بلند حقائق کا مجموعہ اور عبرت وموعظت کا مرقع۔ ایسے ایسے عنوانات جنھیں پڑھ کر بیک وقت آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو آجائیں۔ طنز و تنقید کے ایسے گہرے نشتر اثر و درد کے ایسے خونچکاں منظر شاید ہی کہیں مل سکیں۔ یہ کتاب ہمارے چھ سالہ دورِ آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ ہے۔ ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت مجلد مع گرد پوش دو روپے آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ کوی روڈ۔ (صدر) کراچی